طالب شاہ آبادی، پی ایچ ڈی

# بھولے کبوتر
# ہوشیار سانپ

(افسانوں کا مجموعہ)

شمالی ہندوپاک کے مسیحی معاشرے کی ایک جھلک

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ
پرانا قلعہ۔ لکھنؤ ۱

# بھولے کبوتر
# ہُشیار سانپ

(افسانوں کا مجموعہ)

شمالی ہند و پاک کے مسیحی معاشرہ کی ایک جھلک

مُرتّب

طالب شاہ آبادی - پی، ایچ، ڈی

مرتب ........ طالب شاہ آبادی پی ایچ ڈی
پہلی اشاعت ........ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء
تعداد ........ ایک ہزار
کتابت ........ نثار احمد لکھنوی
طباعت ........ الواعظ صفدر پریس لکھنؤ
ناشر ........ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پرانا قلعہ
لکھنؤ۔ ۱۔ اتر پردیش
ٹیلیفون نمبر ........ ۲۸۳۸۶
قیمت ........ ایک روپیہ پچاس پیسے

# اظہار تشکر

جن احباب نے اس مجموعہ کے لئے اپنے افسانے عطا فرمائے ہیں میں ان کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اس کے ساتھ ہی میں ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کی لٹریچر کمیٹی کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں جس کی مالی امداد سے یہ مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ تبلیغی رسائل کے علاوہ ادبی کتب بھی شائع کر رہا ہے یقین ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کا یہ اقدام اُردو ادب کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہو گا۔

لکھنؤ اتر پردیش
دسمبر ۱۹۷۰ء

**طالب شاہ آبادی**
اسوسی ایٹ ڈائرکٹر
ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ

# فہرست

| نمبر شمار | عنوان افسانہ | افسانہ نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | شمی | طالب شاہ آبادی | ۱۷ |
| ۲ | تصویر | قربان ایم اے | ۲۹ |
| ۳ | سہیلی | طالب شاہ آبادی | ۳۵ |
| ۴ | منزل | اختر کاشمیری | ۳۹ |
| ۵ | گزرتے سائے | راغب رضوانی ایم اے | ۴۳ |
| ۶ | چوتھا موڑ | رفیق ایم ایس سی آنرز | ۵۱ |
| ۷ | دردِ نہاں | رفیق ایم ایس سی آنرز | ۶۱ |
| ۸ | کالی اوڑھنی | خیال لدھیانوی بی۔ اے | ۷۰ |
| ۹ | شیطان | طالب شاہ آبادی | ۸۷ |
| ۱۰ | بہتے آنسو | اختر کاشمیری | ۹۱ |
| ۱۱ | سویرا | اختر کاشمیری | ۹۶ |
| ۱۲ | شفق کے اُس پار | اختر کاشمیری | ۱۰۰ |
| ۱۳ | کونپل | طالب شاہ آبادی | ۱۰۵ |
| ۱۴ | طلب کی راہ میں | طالب شاہ آبادی | ۱۱۲ |
| ۱۵ | نظارہ | یوسف جلیل ایم اے | ۱۱۷ |

| نمبر شمار | عنوان افسانہ | افسانہ نگار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱۶ | جنازے کی بارات | جوزف انور | ۱۲۹ |
| ۱۷ | شبنم یا آنسو | حیا لدھیانوی | ۱۳۷ |
| ۱۸ | بچوں کا بڑا دن | قربان ایم اے | ۱۵۰ |
| ۱۹ | اندھیرا | رفیق ایم ایس سی آنرز | ۱۵۶ |
| ۲۰ | دوج کا چاند | رفیق ایم ایس سی آنرز | ۱۶۶ |
| ۲۱ | زرد گلاب | اختر کاشمیری | ۱۸۶ |

# پیش لفظ

ہند و پاک کے مسیحی ادباء نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں اگر کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے تو نہ سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے ایک خاموش خدمت ضرور انجام دی ہے۔ مسیحی ادباء نے انیسویں صدی کے آخر سے آج تک اُردو میں ہزاروں کتابیں لکھ ڈالی ہیں جن میں سے زیادہ تر مذہبیات سے متعلق ہیں۔ اس عظیم انبار میں جہاں نثر نگاری کے اعلیٰ نمونے موجود ہیں وہاں منظوم کلام کے شہ پارے بھی نظر آتے ہیں، گو قصّوں کہانیوں کی بہت سی کتابیں معرض وجود میں آئیں مسیحی معاشرہ سے متعلق مختصر افسانوں کے مجموعے بہت کم نظر آتے ہیں۔ مسیحی اردو ادب میں مختصر افسانوں کے گنے چنے مجموعے موجود ہیں لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے آج تک کوئی ایسا مجموعہ نہیں چھاپا گیا ہے جس میں متعدد مسیحی افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہوں۔ افسانوں کے چند مجموعے جو شائع ہوئے ہیں بیشتر ایسے ہیں جو ایک ہی افسانہ نگار کے افسانوں پر مشتمل ہیں، ایسے دو مجموعے جو میری نظر سے گزرے یہ ہیں۔

(۱) مختصر افسانے مصنّفہ جناب جلال الدین چودھری بی اے مشعل پریس کھرڑ ۱۹۴۵

(۲) اصلاحی افسانے مصنّفہ جناب ارنسٹ ڈی ڈین بی اے مکتبہ زندگی بازار چتلی قبر دہلی۔

ان کے علاوہ اگر اور مجموعے شائع ہوئے بھی ہیں تو وہ میرے علم میں نہیں ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر میں یہ کہوں کہ "بھولے کبوتر ہوشیار سانپ" اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں آٹھ مسیحی افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا یہ افسانہ نگار بقیدِ حیات ہیں اور گاہ گاہ اردو کے مسیحی جرائد میں ان میں سے بعض کی تخلیقات چھپتی رہتی ہیں۔ ان آٹھ افسانہ نگاروں میں نئے اور پرانے لکھنے والے دونوں ہی شامل ہیں۔

ہند و پاک کی مسیحی جماعت میں بہترین لکھنے والے موجود ہیں لیکن اس مجموعہ میں صرف انہی اشخاص کے افسانے شامل ہیں جنہوں نے ازراہِ کرم میری دعوت پر لبیک کہا مجھے اپنے افسانے بھجوائے اور اجازت مرحمت فرمائی کہ میں انہیں ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کر سکوں جن ادیبوں نے اس کارِ خدمت میں تعاون کیا ہے میں ان کا ممنون ہوں اور جن اصحاب نے باوجود وعدوں کے افسانے مرحمت نہیں فرمائے ان سے دوستانہ گلہ کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے وعدے پورے نہ کیے تاہم یار زندہ صحبت باقی۔

ہند و پاک کے مسیحی معاشرہ کی تشکیل میں مختلف نسلوں، قوموں اور جماعتوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اس برصغیر میں بولی جانے والی سبھی زبانوں کے نمائندے اس معاشرہ میں موجود ہیں۔ اگر آپ یہاں کے مسیحیوں کے ناموں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی سکھ بھی ہیں اور پارسی بھی، قبائلی بھی ہیں اور پس ماندہ اقوام کے لوگ بھی مسیحی کلیسیا جہاں ان مختلف اور گوناگوں تہذیبی اور لسانی قدروں سے مالا مال ہوئی وہاں اسے متعدد معاشرتی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا لیکن خدا کا شکر ہے کہ گزرے سو سال کے عرصہ میں یہاں کے مسیحیوں نے اپنے آپ کو ایک مخصوص مقامی معاشرہ میں ڈھال لیا ہے اور اب وہ ایک عظیم اور متحدہ اقلیت کی صورت میں ترقی کی راہوں پر

گامزن ہیں۔

ہر معاشرہ میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں اور بری بھی، جہاں ہم معاشرہ کو اسکی برائیوں کیلیے مورد تنقید قرار دیتے ہیں وہاں اسکی خوبیوں کے پیش نظر اس کی شان میں تعریفی کلمات بھی کہتے ہیں اس مجموعہ کے بھی افسانے مسیحی معاشرہ سے متعلق ہیں افسانہ نگار اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اس سوال کا جواب اس مجموعہ کے پڑھنے والوں کو دینا چاہیے میں نے دانستہ طور پر ان افسانوں کے حسن و قبح پر اپنی رائے نہیں دی ہے یہ کام ناقدین ادب کا ہے اور وہی اس کو سرانجام دیں گے۔

یہ مجموعہ اردو کے چند گمنام مسیحی افسانہ نگاروں کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے کی پہلی کوشش ہے انشاء اللہ اس کے بعد اور مجموعے بھی تیار کیے جائیں گے اور یوں مسیحی جماعت کے بہترین ادبار کا تعارف اردو دان اور اردو نواز احباب سے ہو جائے گا۔

افسانہ نگاروں کے مختصر حالات زندگی بھی مجموعہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں مجھے یقین ہے کہ افسانوی رموز و اسرار کے ادراک کیلیے یہ مختصر کوائف و احوال ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

جن احباب نے اس مجموعہ کیلیے افسانے عطا فرمائے ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ انکی تخلیقات کو قدر کی نگاہوں کے دیکھنے والے موجود ہیں اور اس مجموعے کا خیر مقدم انہی قدر دانوں کی طرف سے ہوگا۔

اگر بہ خدمت یاران من رسی اے باد
سلام من برسانی کہ من دعا گفتم
(خسرو)

لکھنؤ اتر پردیش

طالب شاہ آبادی

# افسانہ نگاروں کا تعارف

## (۱) اختر کاشمیری

اصلی نام مسز ودیاتی خاں ہے سال پیدائش ۱۹۳۴ء اور جائے تولد شہر لاہور ہے، اسکول کے دنوں ہی سے افسانہ نگاری کا شوق تھا، شادی کے بعد افسانہ نگار خاوند کے زیر اثر یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا، آج تک تقریباً دو درجن افسانے لکھ چکی ہیں جن میں سے اکثر ایمان دہلی اور زندگی دہلی میں شائع ہو چکے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ادیب عالم اور ایف اے کر لیا ہے اب بی اے کی تیاری کر رہی ہیں۔ تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا کالج میں ہے دوسرا لڑکا ہائی اسکول میں اور سب سے چھوٹی لڑکی نویں کلاس میں ہے۔ مسز خان کا دہلی میں اپنا اسکول ہے جس میں چھوٹے چھوٹے بچے پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔ سکول کی نگرانی، گھر کی دیکھ بھال اور تین بچوں اور خاوند کی خدمت ایسی مشغول رکھنے والی ذمہ داریوں کے باوجود وہ افسانے لکھنے اور کتابیں پڑھنے کے لئے وقت نکال لیتی ہیں۔

اختر کے افسانے عموماً مسیحی سماج کی روشن قدروں کے حامل ہوتے ہیں انکے افسانوں کی زبان سادہ ہے ان میں واقعیت زیادہ اور وعظ کا عنصر کم ہے۔

## (۲) جوزف انور اجمیری

نام عمانوایل جوزف ہے اور انور تخلص ہے آج کل

سابرمتی (احمد آباد) میں قیام ہے، شاعری کی طرف رجحان زیادہ ہے لیکن نثر بھی خوب لکھتے ہیں، ۳ر دسمبر ۱۹۲۸ء میں بمقام اجمیر پیدا ہوئے ایک خط کے جواب میں فرماتے ہیں

"بچپنہ آوارگی، لڑکپن بے راہ روی اور جوانی عاشقی میں گزری کہنے کو جوان تو اب بھی ہوں مگر وہ دم خم نہیں۔ اپنا ہی ایک دوہا ہے۔

تن من دونوں دش بھرے میں کیا دوں تجھ کو بھوگ
من میں ہیں جو پاپ سو تو تن میں سو روگ

تین سال فوجی ملازمت کی اب ریلوے میں بطور گارڈ ملازم ہوں، ایک بیوی اور پانچ بچے ہیں اب آگے اللہ اللہ ہے"

انور صاحب کا ایک ہی افسانہ ہاتھ آیا اور وہی اس مجموعہ کی زینت ہے انور صاحب کا طرز تحریر بڑا شگفتہ اور بڑا پیارا ہے، مجھے ان کے خطوں سے یہ اندازہ ہوا کہ اگر وہ چاہیں تو بڑے اچھے مزاح نگار بن سکتے ہیں ـــ لیکن ایک بیوی اور پانچ بچے! پھر ریلوے کی ملازمت طنز ومزاح والا موڈ پیدا بھی ہونے دیں۔

## (۳) حیاؔ لدھیانوی

پورا نام یوسف خاں ہے ۱۹۳۱ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے حیاؔ افسانوی نام ہے، گو یہ نام بڑا شاعرانہ ہے مگر حیاؔ صاحب شاعری نہیں کرتے ہاں شعر فہم اور بذلہ سنج ضرور ہیں۔ دلی میں پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں ایک اچھے عہدہ پر مامور ہیں۔ افسانہ نگاری کا شوق ہائی اسکول

چھوڑنے کے بعد پیدا ہوا۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی سے ایک ادبی اور مذہبی ماہنامہ "ایمان" جاری کیا اور اس میں لکھتے رہے ان کے کچھ افسانے "زندگی" دہلی میں بھی شائع ہوئے پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور بی اے کیا ہے، اردو ادب سے والہانہ عشق ہے کوئی نیا ناول یا افسانوں کا مجموعہ بغیر پڑھے نہیں چھوڑتے۔ شادی شدہ ہیں، بیوی (اختر کاشمیری) اور تین بچّوں کے ساتھ دہلی (ڈبل بنگش) میں مقیم ہیں۔ مذہبی امور میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

حیاؔ کے افسانوں میں نفاستِ زبان کے علاوہ طنز یہ تیر و نشتر بھی موجود ہیں وہ واقعہ نگاری میں ماہر ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں اُن کے افسانے رواں دواں مترنّم جھرنے ہیں۔

## (۴) راغب رضوانی

راغبؔ رضوانی کا اصلی نام ونسنٹ بھجن ہے ۱۹۳۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے آج کل نئی دہلی میں قیام ہے۔ سرکاری ملازم ہیں ادیب فاضل اور بی اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اس سال دہلی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ شادی شدہ ہیں تین بچوں کے باپ ہیں، شاعری کی طرف زیادہ راغب ہیں، کتابیں پڑھنے کا شوق جنون تک پہنچا ہوا ہے جاسوسی ناول زیادہ پڑھتے ہیں۔ راغبؔ کے طالب علمی کے زمانہ کا ایک افسانہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔

(۵) **رفیق ایم ایس سی آنرز** پورا نام سلاتی ایل رفیق ہے،

پانچ جولائی ۱۹۳۷ء میں پنجاب فریدکوٹ کے مقام پر پیدا ہوئے اس لئے نام کے آگے فریدکوٹی لکھتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی آنرز کیا۔ آج کل گورنمنٹ کالج بھٹنڈہ پنجاب میں فزکس کے استاد ہیں اور پروفیسر رفیق کے نام سے مشہور ہیں۔ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں۔ رفیق صاحب نے اپنا مستقبل نہایت ہی کوشش اور محنت سے بنایا ہے اسی لئے وہ جفاکشی کے عادی ہیں ان کے افسانوں میں مشرقی طرز کی سیدھی سادی زندگی بسر کرنے اور اونچے عزم و ارادے رکھنے کی تلقین پائی جاتی ہے وہ مسیحی لڑکیوں کی فیشن پرستی بے راہ روی اور گمراہی کے ہمیشہ شاکی رہے ہیں اور سچے دل سے ان کی اصلاح چاہتے ہیں چنانچہ ان کے افسانوں میں اصلاح کی یہ تمنا کبھی للکار بن کر گونجتی ہے کبھی چیخ بن کر دل و دماغ کو لرزا دیتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ اور دلکش ہے اور باوجود پنجابی ہونے کے وہ بڑی پیاری اردو لکھ لیتے ہیں۔ ان کے کئی افسانے زندگی دہلی اور نورافشاں سہارنپور میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ تیار ہے جسے وہ کتابی صورت میں چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ افسانہ نویسی کے علاوہ وہ فوٹوگرافی، مصوری اور دینی خدمت میں وقت گزارنا پسند کرتے ہیں۔

## (۶) طالب شاہ آبادی

اس مجموعہ کے مرتب کی حیثیت سے مجھے اپنے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ میں ۱۹۲۴ء میں شاہ آباد (بہار) میں پیدا ہوا میں نے ابتدائی تعلیم رائے ونڈ ضلع لاہور میں پائی ۱۹۴۲ء میں پنجاب یونیورسٹی

لاہور سے منشی فاضل کیا اور دو سال تک اُردو فارسی پڑھاتا رہا۔ دو سال مرے کالج سیالکوٹ میں بھی گزارے تقسیم وطن کے بعد دہلی آگیا اور آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا۔ پنجاب سے ایم اے ایم او ایل فارسی میں کیا، ۱۹۵۷ء میں ملازمت چھوڑ دی اور اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ دو سال امریکا میں اسلامیات کی تعلیم کے لئے اور تین سال ایران میں تصوف اسلامی کے مطالعہ میں گزارے۔ ۱۹۶۲ء میں تہران یونیورسٹی سے ادبیات فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ہندوستان لوٹا اور تب سے ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہوں۔ آج کل اپنی اہلیہ اور تین بچوں سمیت لکھنؤ میں مقیم ہوں انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی اُردو مجلہ ہما میری ہی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

افسانہ نویسی کا شوق اسکول کے دنوں سے شروع ہوا اور اب تک ہے۔ میرے چند مذہبی افسانے مختلف ناموں سے "ایمان" دہلی میں شائع ہوئے وہی اب اس مجموعہ میں شامل ہیں میرا محبوب ترین افسانہ نگار اے حمید ہے۔

## (۷) قربان ایم اے

اصل نام ڈی اے ہیرسن ہے ۱۲ر مارچ ۱۹۱۹ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ طالب علمی کے زمانہ ہی سے نثر نگاری کا شوق تھا۔ متعدد افسانے اور ڈرامے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ برنارڈ شاہ کے ایک انگریزی ڈرامے کا اُردو ترجمہ غلام اینڈروکلس و شیر شائع بھی ہو چکا ہے۔ شاعری کا شوق بھی ہے اور قربان تخلص ہے۔ انگریزی اور اردو ادب میں ایم اے ہیں اور فارسی میں اعلیٰ کامل کا امتحان الٰہ آباد سے پاس کیا ہے

آجکل مغربی بنگال میں انگریزی ادب کے استاد ہیں۔

قربان کے افسانوں میں واقعہ نگاری کے علاوہ ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے انکی زبان گھروں میں بولی جانے والی اردو سے شباہت رکھتی ہے اور اسی لئے ان کا طرزِ تحریر دلکش اور شگفتہ ہوتا ہے۔ طنز نگاری کا بھی شوق ہے اور خوب لکھتے ہیں۔

## (۸) یوسف جلیل

یوسف جلیل ملتان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور اپنی شخصی محنت اور قابلیت کے طفیل ترقی کرتے کرتے کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ آج کل وہ گارڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہیں، وہ پاکستانی مسیحیوں میں غالباً پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو فارسی میں ایم اے کرنے کے علاوہ اسلامیات اور عربی میں بھی ایم اے کیا ہے۔ اردو ادب کی ترویج و اشاعت سے انہیں بے حد دلچسپی ہے آج کل کرسچن سٹڈی سنٹر راولپنڈی کے دوماہی "نقیب" "المشیر" کے مدیر اعلیٰ ہیں انکے مذہبی مضامین کی زبان ادبی ہے لیکن افسانوں میں ان کا لب و لہجہ نہایت ہی سادہ اور فطری ہوتا ہے۔ یوسف صاحب کا صرف ایک افسانہ اس مجموعہ کی زینت ہے یہ افسانہ مسیحی معاشرہ کو ایک شدید خطرے سے آگاہ کرتا ہے۔ یوسف جلیل کے بعض تاریخی افسانے بھی میری نظر سے گزرے ہیں اور ان افسانوں سے یوسف صاحب کے وسیع مطالعہ کا پتا چلتا ہے

یوسف صاحب کو شاعری کا شوق بھی ہے لیکن اسلامیات اور فلسفہ کے مطالع نے انہیں شاعر کی بجائے ادیب بنا دیا۔

# ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ

یہ انسٹی ٹیوٹ اکتوبر ۱۹۶۶ء سے لکھنؤ میں خدمات انجام دے رہا ہے انسٹی ٹیوٹ کا مرکز اور کتب خانہ فی الحال ایک کرایہ کی عمارت میں قائم ہے لیکن مستقبل قریب میں انسٹی ٹیوٹ کی اپنی عمارت تیار ہو جانے پر یہ ادارہ مستقل طور پر حیدرآباد دکن منتقل ہو جائے گا۔

یہ انسٹی ٹیوٹ ۱۹۳۰ء میں بطور مدرسہ مشہور اور جواں مرگ مبلّغ ہنری مارٹن کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا، لاہور، مسوری، علیگڈھ اور جبلپور میں بیش بہا خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۶۶ء میں مستقل طور پر لکھنؤ منتقل کر دیا گیا، انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ لکھنؤ کے علاوہ اطراف ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اور علم الٰہیات کی مسیحی درسگاہوں اور دیگر مسیحی اداروں اور کلیساؤں میں اسلامیات اور اسلام و مسیحیت کے تقابلی مطالعہ اور رشتہ پر لکچر دیتے اور سیمینار منعقد کرتے ہیں انسٹی ٹیوٹ کے کتاب خانہ میں انگریزی کے علاوہ عربی فارسی اور اردو زبانوں میں اسلامیات پر کافی ذخیرہ موجود ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے مرکزی دفتر سے انگریزی اور اُردو میں دو سہ ماہی مجلّے بھی شائع ہوتے ہیں اور ان دونوں زبانوں میں اسلام اور مسیحیت پر مراسلتی نصابات بھی جاری ہیں جو شائقین حضرات کو ان کی درخواست پر روانہ کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ انسٹی ٹیوٹ ہندوستان میں خدمت کرنے والی تمام منظم مسیحی کلیساؤں

اور سوسائٹیوں کا متحدہ ادارہ ہے اور اسے نیشنل کرسچین کاؤنسل آف انڈیا اور ورلڈ کاؤنسل آف چرچز کی حمایت حاصل ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کے اُردو سہ ماہی مجلّہ کا نام لکھنؤ نما ہے جس کا سالانہ چندہ صرف چار روپیہ ہے جن اغراض و مقاصد کے لئے یہ مجلّہ جاری کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

(١) مسیحیوں میں اسلام کے سنجیدہ مطالعہ کا ذوق پیدا کرنا۔

(٢) اردو خوان مسیحی مبشروں کے لئے ایسا مواد فراہم کرنا جو انہیں اپنے مسلم احباب سے دوستانہ تبادلہ خیالات کرنے میں مدد دے سکے۔

(٣) ایسے مقالات شائع کرنا جن سے مسیحی حضرات اسلامی عقائد سے اور مسلم احباب مسیحی عقائد سے آشنا ہو سکیں۔

(٤) جہاں تک مذہبی اور معاشرتی مسائل کا تعلق ہے مسیحی و مسلم اقلیتوں کو افہام و تفہیم کے جذبہ کے تحت ایک دوسرے کی نسبت ہمدردانہ اور دوستانہ رویّہ اختیار کرنے کی تشویق و ترغیب دینا

(٥) مسیحی اور مسلم علماء کے چند بنیادی اختلافات کے باوجود بھی گاہ گاہ بالمشافہ گفتگو اور تبادلہ خیالات کرنے کے لئے راہیں ہموار کرنا۔

(٦) مسیحی علماء کو اسلامیات پر اور مسلم علماء کو مسیحی موضوعات پر تحقیقی اور مذہبی مقالے لکھنے اور شائع کرنے کی دعوت دینا۔

(٧) اسلام اور مسیحیت سے متعلق ایسی کتابوں کے جو ہر دو مذاہب میں قابل احترام سمجھی جاتی ہوں۔ تراجم شائع کرنا۔

# شمّی

بتّو کے دونوں پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو گئے تھے اور میم صاحبہ ڈرائنگ روم سے چلا رہی تھیں "شمّی کہاں مر گئی تو جلدی آ۔ بتّو کب سے کھڑا چیخ رہا ہے۔" شمّی باورچی خانے میں گیلی لکڑیوں میں سر دیئے پھونک پر پھونک مار رہی تھی مگر آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ بچاری کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئی تھیں میم صاحبہ کی آواز سنتے ہی اٹھی، اور ناک پونچھتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف دوڑی۔ بتّو باہر برآمدے میں پھولوں کے گملوں کے پاس منہ بسورے کھڑا تھا شمّی نے اسے اٹھایا اور غسل خانے میں لے گئی، دونوں پاؤں صاف کئے موزے بدلے جوتے پہنائے اور ڈرائنگ روم میں لے گئی میم صاحبہ نے نظر اٹھا کر پہلے بتّو کو پھر شمّی کو دیکھا۔ پھر شمّی کی اداس اداس آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر بولیں "تو آج پھر روئی ..... میرا کیا ہے روتی رہ قیامت تک ..... میں نے تو کہہ دیا ہو گا وہی ... گاؤں جائے گی بچاری .... جیسے اسی کا انتظار ہے سارے گاؤں کو .... دو وقت کھانا ملتا نہیں وہاں اور بچاری چلی ہے گاؤں بڑا دن منانے دیکھ شمّی! کام کرنا ہے تو آدمیوں کی طرح کر مجھ سے تیرے نخرے نہیں دیکھے جاتے۔" .... شمّی نے بتّو کو گودی سے نیچے اتارا وہ حیرانی سے اپنی آیا کا منہ تکنے لگا پھر شمّی کو

دیکھا وہ سر جھکائے کھڑی تھی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ بار بار ناک پونچھ رہی تھی۔۔۔۔ میم صاحبہ پھر تنک کر بولیں "اب جا بھی کام کر اپنا"۔۔۔۔ وہ خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ڈرائنگ روم سے نکلی اور باورچی خانے کی طرف مڑی۔

آگ اپنے آپ جل رہی تھی اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کیتلی میں چائے کے لئے پانی چڑھا دیا اور پھر دیوار کے سہارے ٹنگی ہوئی ٹوکری اتاری اور سبزی کاٹنے لگی آج اسے رہ رہ کر میم صاحبہ پر غصہ آ رہا تھا سال ہونے کو آیا لیکن وہ اپنی ماں سے ملنے نہ جا سکی۔ اب سوچا تھا بڑے دن کے نزدیک ہو آؤں گی چند دنوں کے لیئے اور وہ چند روپے جو اس نے جمع کئے تھے ماں کے کام آ جائیں گے اس نے ماں کے لئے کچھ کپڑے بھی سلوائے تھے لیکن اب جب اسے اپنی تمام تمناؤں کا خون ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا تو وہ اداسیوں سے لپٹ سی گئی، پادری صاحب سے کہتے ڈرتی تھی وہ آج تک ان سے کبھی کچھ نہ کہہ سکی تھی اب چھٹی مانگتی تو وہ بھی یہی کہتے "میم صاحبہ سے پوچھ لو" ناچار اندر ہی اندر جل رہی تھی۔۔۔۔۔۔ میم صاحبہ کہتی تھیں اس بار کرسمس پر بہت سے مہمان آ رہے ہیں میم صاحبہ کے تمام لڑکے اور لڑکیاں بڑا دن گھر پر منائیں گے کام زیادہ ہوگا، اور شمی کی سخت ضرورت ہوگی۔

۔۔۔۔ بیچاری ویسے بھی تمام دن بیل کی طرح جتی رہتی تھی اور اب جوں جوں کرسمس کے دن نزدیک آ رہے تھے شمی کی اداسیاں بڑھتی جا رہی تھیں مگر اس تمام کنبے میں کوئی اس کا غمگسار نہ تھا۔

شمی گاؤں کی ان چند لڑکیوں میں تھی جن میں گاؤں بھر کا حسن مجسم تھا بیوہ ماں کو گاؤں کی یقینی آزمائشوں سے بچانے کے لئے پادری صاحب شمی کو بیٹی بنا کر لے گئے مگر رکھا نوکرانی کی طرح۔۔۔۔ اور بڑھیا نے چار ٹکڑوں کے عوض اپنا کلیجہ نکال کر پادری صاحب کو دیدیا، پادری صاحب اچھے آدمی تھے انہیں شمی کی عزت کا

خیال تھا وہ اسے گاؤں کے تاریک ماحول سے نکال کر روشنی میں رکھنا چاہتے تھے مگر میم صاحبہ کہتی تھیں "یہ اونٹ سی لڑکی کیا پڑھے گی" مگر حقیقت تو یہ تھی کہ شمی کا معصوم چہرہ اس کا گداز جسم اس کا ملکوتی حسن میم صاحبہ کی نظروں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا میم صاحبہ کی اپنی بھینگی اور سیاہ فام لڑکیوں کے چہرے شمی کے ایک تبسم آمیز انداز کے سامنے مرجھائے ہوئے نظر آتے تھے اور وہ خوب جلتیں اور برے سے برا سلوک کرتیں۔ مگر شمی کے پہلو میں گاؤں کی فضا میں پرورش پایا ہوا دل تھا وہ گنگناتی اور اپنے کام میں مگن رہتی اب ایک سال ہونے کو آیا تھا وہ اپنی کوشش سے کچھ پڑھ لکھ بھی لیتی تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ اس نے آج تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا پچھلے ماہ جب پادری صاحب کا سب سے بڑا لڑکا جو فوج میں میجر تھا اپنی میم صاحبہ کے ساتھ آیا تھا تو ہزار منت سماجت کے باوجود بھی شمی کو اپنے ہمراہ چلنے کے لیے راضی نہ کر سکا۔ شمی وہ سلیقہ شعار لڑکی تھی کہ جس ماحول میں رہتی اپنے لئے ایک خاص مقام بنا لیتی۔

میز پر چائے کا سامان درست کرتے وقت اس نے دل میں سوچا ایک بار اور میم صاحبہ سے التجا کروں، پھر خود ہی ٹال گئی سوچنے لگی۔ فضول بات ہے ان کے تیور بدلنے والے نہیں ہمت ہوگی تو پادری صاحب سے بات کروں گی مگر وہ بھی تو یہی کہیں گے یعنی ..... وہ ایک دم جھنجھلا سی اٹھی اور فوراً باورچی خانہ میں بھاگ گئی دیگچی میں سے بھاپ نکل رہی تھی ڈھکنا تھرک رہا تھا اور شمی تپائی پر بیٹھے بیٹھے ٹھپک رہی تھی ...... بچاری!

گھر میں بڑے دن کی تقریب منانے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں پادری صاحب دن میں کئی بار بازار جاتے اور میم صاحبہ دن میں کئی بار شمی سے الجھتیں چاہتی تھیں مہمانوں کے آنے سے پہلے گھر جنت بن جائے خود تو کسی کام کا سلیقہ نہ تھا

ہاں شمّی کے دم سے گھر کی حالت کچھ بدل سی رہی تھی ۔ گاؤں کی لڑکی تھی مگر فطرت نے کچھ ایسا سلیقہ اور کچھ ایسا نرالا مذاق شمّی کو ودیعت کیا تھا کہ اچھے اچھے گھرانوں کی سگھڑ لڑکیاں اس کے سامنے ماند رہ جاتیں ۔ باورچی خانہ کے ساتھ والے کمرہ میں نمکین گوشت کو کھٹّا اور املی ملتے ملتے شمّی کو یہ خیال آرہا تھا کہ ابھی تو مہمان بھی کوئی نہیں اور اس قدر کام کرنا پڑتا ہے اگر مہمان آگئے تو میم صاحبہ کے تقاضے جانے کیا رنگ لائیں گے ۔ بچاری سوچتی اور سوچے چلی جاتی اسے یوں محسوس ہوتا گویا اس لمبی چوڑی دنیا میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں ہے ۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اب تو یہ ایک معمول بن چکا تھا ۔

تانگے سے ایوب بھائی اترے اور سیدھے ڈرائنگ روم میں پہونچے ، میم صاحبہ خوشی سے چیخیں "ارے میرے لال" اور پھر فوراً چلّائیں ...... "شمّی او شمّی کب سے چیخ رہی ہوں دوڑ سامان اتار تانگے سے" ـــ شمّی گھبرا کر اٹھی دوپٹہ سنبھالا اور آنکھیں ملتی ہوئی اپنی اندھیری دنیا سے باہر نکلی دیکھا تانگہ کھڑا ہے ایوب بھائی میم صاحبہ سے باتوں میں مشغول ہیں ، بھابی بچوں کو اتار رہی ہیں شمّی نے پہونچتے ہی سب کو سلام کیا اور لگی سامان اتارنے ، جمانے ۔ تانگے والے کو کیا سوجھی جھٹ پٹ سارا سامان اتار دیا ایوب بھائی سے پیسے لیے اور چلا گیا ۔

ڈرائنگ روم میں مسرتوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور شمّی سامان کمرے میں لا رہی تھی ـــ کام ختم ہو چکا تو لوٹی اپنی اندھیری دنیا کی طرف ، میم صاحبہ نے آواز دی رک گئی ڈرائنگ روم میں پہونچی ۔ ایوب بھائی نے گول گول آنکھوں سے اسے سرتاپا دیکھا پھر بولے "شمّی! کیوں کیسی ہو؟ اب تو بہت بڑی ہو گئی ہو" وہ خاموش کھڑی رہی ...... بھابی بولیں "میں تیرے لیے شلوار کرتہ لائی ہوں" وہ بدستور خاموش کھڑی رہی اور پھر چائے تیار کرنے کا حکم پا کر واپس چلی گئی ۔

۲۲ تاریخ تک بہت سے لوگ آ گئے کتنے بھائی کتنی بھابیاں اور کتنے ہی دیور کتنی ہی نندیں گھر واقعی جنّت بن گیا فیشن کی دنیا کے یہ کاغذی پھول ادھر ادھر جھولتے رہے کام بڑھ گیا تھا مگر خدا بھلا کرے نندوں اور بھابیوں کا جو کام میں شمّی کا ہاتھ بٹاتیں اور اسے اپنے گھاؤ کریدنے کے لئے کافی وقت مل جاتا۔

جس دن ضیا بھائی کالج سے آئے مسرتوں اور قہقہوں کا طوفان آگیا انکے ساتھ انکا کوئی دوست بھی تھا سیدھا سادا سا شریف لڑکا ضیا بھائی کیا تھے ایک بجلی تھے ہر طرف کوندتے پھرتے بہنوں سے مذاق بھابیوں سے چھیڑ چھاڑ بچوں کو دن میں کئی بار رلاتے کئی بار ہنساتے گھر میں سب سے چھوٹے تھے ہر ایک ناز اٹھاتا اور بیگم صاحبہ دل ہی دل میں مسرت کے جھولوں پر جھولتیں ـــــ دونوں آتے ہی باورچی خانہ میں گھس گئے بیگم صاحبہ چیختی ہی رہیں "ارے بیٹا نہا دھو کر کھانے کے کمرے میں بیٹھو وہیں چائے آجائے گی" مگر یہ کہاں ماننے والے تھے گھسے چلے گئے اور شمّی کے گرد ہو گئے "چائے بناؤ ہم یہیں پئیں گے اور تمہارے ہاتھ سے پئیں گے" شمّی بھی ایک پل کو مسکرائی بولی "ضیا کیا کالج میں کھانے کو نہیں ملتا" ضیا کہنے لگے "ارے یہ نہ پوچھو تم اس وقت بس جلدی کرو رات بھر کے بھوکے ہیں اور یہ جو میرے ساتھ عارف صاحب ہیں۔ راستے میں کھانے کے قائل نہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ کالج میں لڑکے انہیں "شیخ چلّی" کہتے ہیں" وہ ایک دم کھلکھلا اٹھی اور عارف کو جو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خزاں کی سی مایوسیاں جھلک رہی تھیں۔ شمّی خاموش ہو کر کام میں مشغول ہو گئی۔ بھابیوں اور بہنوں نے شکایتوں کے طومار کھولے "ضیا تم بڑے مطلبی ہو بس پیسوں کی خاطر خط لکھتے ہو" کسی نے پوچھا "ہمارے لئے کیا لائے ہو؟" ضیا بولے "شیخ چلّی" عارف شرمائے، شمّی کو ہنسی آنے لگی اور سب حیران تھے "ارے بھئی یہ کیا مذاق ہوا۔ ضیا بولے "یہ میرے دوست ہیں نام عارف ہے لڑکے مذاق سے شیخ چلّی کہتے ہیں پھر کیا تھا۔

سب طرف ہنسی کے فوارے چھوٹنے لگے اور عارف نظریں نیچی کیے زمین کریدتے رہے

جو بھی آیا کچھ نہ کچھ لایا اور باورچی خانہ کے ساتھ والا کمرہ پھلوں اور کئی قسم کے میوہ جات سے بھر گیا سب اپنے اپنے شوق کے مطابق مست رہتے مگر ضیا تھے کھاؤ اور پھر عادت یہ کہ چرا کر کھایا جائے۔ عارف کو اپنے ساتھ ملا لیا وہ بچارا خواہ مخواہ پھنس گیا، مگر کیا کرتا، طبیعت کے خلاف بھی کئی باتیں کرنا پڑتی ہیں عارف باورچی خانہ کے سامنے کھڑے ہوتے اور ضیا دبے پاؤں ساتھ والے کمرہ میں جاتے کوٹ پتلون کی جیبیں بھرتے اور پھر دونوں گھر کے پیچھے ٹیلے کی طرف پہنچتے یہ حرکت دن میں کئی بار ہوتی مگر سب بے خبر۔ ہاں خبر تھی، تو صرف شمی کو اور وہ بھی ایک دن یوں ہوا کہ وہ اچانک باورچی خانہ سے باہر نکلی تو عارف کو کھڑے دیکھا اندر آواز آئی تو ادھر بڑھی عارف زور سے کھانسے اور ضیا جیبیں سنبھالتے ہوئے باہر لپکے شمی سے ٹکر ہو گئی۔ شمی کے منہ سے دبی سی چیخ نکلی "چور پکڑا گیا" ضیا نے دونوں کان پکڑے "شمی تم بڑی اچھی ہو" بتانا نہیں کسی کو تمہیں ہماری قسم" ضیا باہر دوڑے اور عارف کی نگاہیں شمی کی آنکھوں میں رحم و کرم کی بھیک بن کر سما گئیں بصد مشکل اتنا کہہ پائے "ہماری عزت رکھ لینا"

شمی سوچتی سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اپنی گہری گہری آنکھوں سے سب باتیں دیکھتی اور سوچتی ان لوگوں میں کتنی بناوٹ ہے کتنا تصنع، سب اچھا پہننے اور اچھا کھانے کے خیال میں مست ہیں۔

پادری صاحب لوگوں میں کرسمس کی اہمیت بیان کرتے وقت ان رسموں اور رواجوں کو برا کہتے اور خود ان کے گھر میں تاریکی کے ہی بادل سایہ کیے ہوئے تھے۔

ضیا بھابیوں اور بہنوں سے جھگڑتے اور اکثر کہتے تم شمی کی مدد نہیں کرتی ہو کیوں اسے جان سے مارنا چاہتی ہو؟ وہ بگڑتیں مگر کیا کرتیں جتنا ان سے بن پڑتا شمی کی

مدد کرتیں۔ عارف صرف ایسے تھے جو سب سے الگ تھلگ گم صم رہتے۔ شمی اکثر سوچتی یہ نوجوان اتنا مغموم کیوں سا ہے اکثر صبح کو باہر جنگلے کے پاس تار پہ ہاتھ رکھے وہ کھڑا رہتا اور دیر تک مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو تاکتا رہتا۔ شمی باورچی خانہ میں دھوئیں اور تاریکی کے ماحول میں عارف کے لئے سوچتی اور سوچے چلی جاتی شاید شمی کے اپنے گھاؤ عارف کے دل کے گھاؤ سے ملتے ہوں اور وہ بھی دور کسی غلیظ اور ویران گاؤں میں پڑی ہوئی کسی غریب بیوہ ماں کے لئے سوچتا ہو۔ آخر ایک دن شمی سے نہ رہا گیا۔ عارف گرم پانی لینے باورچی خانہ میں آئے وہ صبح سب سے پہلے اٹھتے اور سیر کرنے نکل جاتے پھر کتنی دیر تک جنگلے کے پاس تار پہ ہاتھ رکھے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھا کرتے۔ آج صبح سویرے شیو کے لئے گرم پانی لینے آئے تو شمی کو موقع مل گیا۔ نازک سے دل میں تمام ہمت و قوت جمع کرتے ہوئے وہ بولی "ایک بات پوچھوں؟" عارف رک گئے نظر اٹھا کر شمی کی بے خواب آنکھوں کو دیکھا ان میں بھی خزاں کی سی ویرانیاں جھلک رہی تھیں۔

بولے "ہاں ہاں پوچھو"..... شمی کچھ دیر خاموش رہی اپنے حلق میں بمشکل الفاظ جمع کرتے ہوئے بولی "آپ اس قدر اداس اداس کیوں رہتے ہیں" پھر فوراً جھک کر شرما کر منہ چھپا لیا۔ عارف کے دل میں جیسے کسی نے تمام زخموں پہ مرہم رکھ دیا ہو۔ وہ پہلے مسکرائے بڑی اداس مسکراہٹ، پھر شمی کی طرف دیکھا "تم بھی اداس رہتی ہو اور ہر اداس شخص کو تمام چیزیں اداس اداس دکھائی دیتی ہیں" شمی سوچنے لگی یہ بات تو سچ ہے بولی "آپ نے کیسے جانا کہ میں اداس رہتی ہوں؟" عارف بولے "تمہاری یہ اداس اداس آنکھیں ہر وقت لبریز رہتی ہیں اور سچ پوچھو تو میں خود تم سے اسکی وجہ پوچھنا چاہتا تھا شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں" شمی نے چاہا عارف سے سب کچھ کہہ دے مگر وقت کم تھا لوگ بیدار ہو رہے تھے اور وہ بیگم صاحبہ سے ڈرتی تھی۔

عارف میں اپنے لئے تسلی کا ایک غیر معمولی سہارا پاکر وہ مسرت سے لہرا اٹھی کہنے لگی "آپ کی ہمدردی کے یہ الفاظ بہت قوت بخش ہیں۔ میں کسی وقت آپ کو سب کچھ بتاؤں گی" شمیؔ نے ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ عارف پر نظر ڈالی اور کہا "ضرور بتاؤں گی" عارف نے گرم پانی لیا اور کمرہ میں جاکر شیو بنانے لگا۔ شیشے میں آج پہلی بار اسے اپنی صورت پر پیار آیا وہ مارے خوشی کے گنگنانے لگا باورچی خانہ کی اندھیرے اور دھوئیں سے بھری ہوئی دنیا میں شمیؔ نے اپنے لئے ایک شمع جلالی اور اب اس کے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی ہلکی سرخی پرورش پانے لگی۔

پادری صاحب کی موجودگی میں پروگرام بنایا گیا ۲۴ دسمبر کی رات کو بارہ بجے تمام گھر والے ڈرائنگ روم میں جمع ہوکر خداوند تعالےٰ کی حمد وستایش کریں گے پھر انعامات تقسیم ہوں گے، پھر چھوٹی سی پارٹی ہوگی وغیرہ وغیرہ، پادری صاحب کو رات کے بارہ بجے مقامی گرجے میں عبادت کا بندوبست کرنا تھا لہٰذا گھر پر ان کی موجودگی ناممکن تھی، میم صاحبہ پریشان ہونے لگیں آخر گھر میں عبادت کا ہادی کون ہوگا؟ لڑکے لڑکیوں کو تو کچھ ایسا شوق تھا نہیں سب نے انکار کیا البتہ اس آڑے وقت عارف کام آئے کہنے لگے "واہ اس میں کون سی مشکل ہے میں خود گیت[1] چن لونگا کلام پاک کی تلاوت کردوں گا اور جو کچھ ...... پیغام خداوند کی طرف سے ملے گا پیش کردوں گا" سب خوش ہوئے چلو مصیبت ٹلی۔ عارف بچارے ذرا غیر متدین قسم کے مسیحی تھے بائبل لے کر بیٹھ گئے اور کمرہ بند کرلیا۔ سب چیخے "ارے بھئی یہ کیا مذاق ہے دنیا سے کنارا کرلیا" وہ اندر سے ذرا سخت لہجہ میں بولے "یہ مذاق نہیں ہے خدا کے لئے کچھ دیر مجھے تنہا چھوڑ دو" آخر سب لوگ الگ ہوگئے۔

میم صاحبہ نے شمیؔ کو ہدایات دیدیں کہ رات کے بارہ بجے کے قریب آتش دان سلگنا چاہیئے چائے کا سامان تیار ملے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا اللہ کا جی رکھنے کو

---

[1] کرسمس پر کچھ مخصوص گیت گائے جاتے ہیں

"شمی تجھے بھی انعام ملے گا" شمی بچاری خوش تو کیا ہوتی البتہ اتنا ضرور محسوس کر رہی تھی کہ کوئی انقلاب آنے والا ہے اس دن عارف نظر تک نہیں آئے ہاں شام کے وقت لمحہ بھر کو بات ہوئی تھی پوچھنے لگے "ہم بازار جا رہے ہیں تمہارے لئے کیا لائیں" اور جب ان کی دونوں آنکھیں مجسم سوال بن گئیں تو شمی نے جواب کے لئے الفاظ تلاش کرنا شروع کئے مگر باوجود کوشش کے وہ کچھ نہ کہہ سکی فقط سر جھکا کر رہ گئی عارف جانے کیا سمجھے چپ چاپ چلے گئے اور آج اپنے کمرہ میں بند بیٹھے ہیں بائبل لے کر، ضیا کئی بار دروازہ پیٹ چکے ہیں مگر کچھ بن نہیں پڑتا۔

شمی نے ساڑھے گیارہ بجے کا الارم لگا دیا تا کہ میم صاحبہ اور دوسرے گھر والے وقت پر اٹھ سکیں اور وہ خود سوچ رہی تھی اسے کہاں سونا ملے گا کتنا کام اس کیلئے جمع ہو چکا تھا، ضیا بھائی اور عارف بازار سے بہت کچھ لائے تھے مگر شمی کو کیا خبر تھی۔ رات کو کھانا کھا چکنے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں گھس گئے ضیا بھائی بھی جلدی سو گئے البتہ پادری صاحب اور عارف ڈرائنگ روم میں دیر تک بیٹھے کرسمس سے متعلق باتیں کرتے رہے عارف کو نیند نہیں آ رہی تھی اور پادری صاحب کو آدھی رات کی عبادت کا خیال تھا شمی باورچی خانہ میں اپنے خوابوں میں الجھی بھولی چولھے کے سامنے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی آگ جل رہی تھی اور اس کی سرخ سرخ روشنی میں شمی کا چہرہ دمک رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب پادری صاحب اپنا اوور کوٹ پہنے باہر نکلے اور ٹارچ کی روشنی میں جنگلے کی طرف بڑھ گئے آسمان میں ستاروں کی شمعیں روشن تھیں۔ رات خاموش اور سخت سرد تھی۔ شمی کو ڈرائنگ روم کے آتش دان کا خیال آیا وہ اٹھی اور مناسب لکڑیاں چن کر انہیں اٹھایا اور ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔ بتی جل رہی تھی عارف ایک صوفے میں بیٹھے تھے سر جھکا ہوا سامنے والی میز کے سہارے ٹکا تھا شاید بچارے تنہا بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے

سامنے بائبل کھلی رکھی تھی اور عارف کے دونوں ہاتھ اس پر پھیلے ہوئے تھے۔ شمی کو ان پر ترس آگیا جلدی جلدی آتش دان میں آگ جلائی لکڑیاں کم تھیں اور لے آئی عارف ابھی تک سو رہے تھے شمی ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ انہیں جگائے کہ دور شہر کے بیچوں بیچ گرجے کا گھنٹہ بجنے لگا اور اس کی آواز آج اس قدر پرترنم تھی کہ جھوم جانے کو جی چاہتا تھا عارف فوراً گھبرا کر اٹھ بیٹھے آنکھیں ملیں انگڑائی لی دیکھا تو شمی آتشدان کے پاس کھڑی تھی چاروں طرف دیکھا پھر مسکرائے بولے "مجھے نیند آگئی کیا پادری صاحب چلے گئے؟" شمی بولی "جی ہاں گرجے کا پہلا گھنٹہ بھی بج گیا ہے آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی؟" عارف بولے "نہیں بالکل نہیں تم کھڑی کیوں ہو آؤ بیٹھ جاؤ" شمی وہیں آتشدان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ عارف نے وقت کو غنیمت جانا اور پوچھ ہی لیا "شمی آج بتاؤ کچھ اپنے بارے میں" شمی بولی سب کچھ بتادوں گی مگر وعدہ کیجئے کہ آپ اسے اپنے تک ہی محدود رکھیں گے" عارف نے یقین دلایا اور شمی نے اپنا زخموں سے بھرا ہوا دل کھول کر عارف کے سامنے رکھ دیا گاؤں کے دنوں سے لے کر دسمبر کی اس سرد رات تک، جو کچھ شمی کو پیش آیا تھا سب عارف سے کہہ دیا، عارف خاموشی سے سن رہے تھے اور انکے دل کے کسی پہلو میں جاگا ہوا رحم جوان ہو رہا تھا۔ عارف نے کہا "شمی میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں چندماہ بعد میں زندگی میں نیا قدم رکھنے والا ہوں پڑھائی ختم ہو جائے گی نوکری ملنے کی امید ہے میں تمہارا دکھ بانٹنے کی کوشش کروں گا" شمی صرف اتنا کہہ سکی "آپ کتنے اچھے ہیں۔" میم صاحبہ کے کمرے میں، گھڑی نے الارم بجانا شروع کیا، شمی تیزی سے باورچی خانہ کی طرف دوڑی اور پانی سے بھری ہوئی کیتلی چولہے پر چڑھادی ہنگامہ شروع ہوا کچھ لوگ اٹھے کچھ سوئے رہے اور ڈرائنگ روم میں عارف نے مختصر سی عبادت کرائی۔ انعام بانٹنے کا وقت آیا مگر سب حاضر نہیں تھے میم صاحبہ سب کو

۲۵۴۵۲ ۲۷

سمجھا بجھا کر لائیں اور پھر قہقہوں کا دور شروع ہوا۔ انعامات تقسیم ہوئے سب کو کچھ نہ کچھ ملا۔ عارف سب کے لئے کچھ نہ کچھ لائے تھے سب کو دے چکے تو شمی کو آواز دی۔ بچاری آگے بڑھی اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے چھوٹا سا پیکٹ تھام لیا۔ سب نے کہا "کھول کر دکھاؤ" عارف چیخے "ارے شمی خدا کے لئے یہاں نہ کھولنا بڑا مذاق ہوگا میں عجب آدمی ہوں بھاگ۔ جاؤ فوراً" اور واقعی شمی پیکٹ کو لئے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی اور اسے اپنے صندوق میں جا چھپایا۔ چائے کا دور شروع ہوا، ترنم قہقہوں کے پھول چاروں طرف بکھرتے رہے اور بزرگ اونگھ رہے تھے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ڈرائنگ روم پھر پہلے کی طرح اداس اداس سا دکھائی دینے لگا۔ سب اٹھ کر جا چکے تھے البتہ ضیا اپنی بھدی آواز میں گنگنا رہے تھے اور عارف آتشدان کے قریب سر جھکائے جانے کون سی دنیا میں سرگرداں تھے جب ضیا اپنی نغمہ باریوں سے خود بھی سیر ہو چکے تو عارف کو جھنجھوڑ کر کہنے لگے "تمہیں نیند آ رہی ہے تو جاؤ بستر میں سو رہو کیوں یہاں کا ماحول بگاڑ رہے ہو۔" عارف چونکے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "یونہی کچھ سوچ رہا تھا" ضیا کچھ اور چہکے "یار آجکل تمہیں سوچنے کی بہت عادت ہو گئی ہے کیا کچھ سوچ لیا ہے۔" عارف جیسے کسی وجد آور کیف میں گم تھے ضیا کو غور سے دیکھا اور بولے "ایک فیصلہ کیا ہے" ضیا حیران ہوئے پوچھا "آخر ہم بھی تو سنیں۔" عارف نے ضیا کو کالج سے نکلنے کے بعد نوکری اور پھر شادی کا تمام پروگرام کہہ سنایا۔ ضیا حیران تھے کہ آج عارف کو کیا ہو گیا وہ تو سبھی لڑکیوں کو فیشن پرست کہہ کر شادی کی بات ٹال دیا کرتے تھے اور اب یکایک شادی کا ارادہ کر لیا۔ ضیا یہ معمہ سمجھ نہ سکے عارف سے ملتجیانہ انداز میں پوچھا "بھئی صاف صاف کہو کیا بات ہے ہم کوئی غیر تو نہیں۔" عارف کے اندر سے جیسے کوئی بول اٹھا "ضیا! میں شمی سے شادی کروں گا اور اس کو اس بلندی تک لے جاؤں گا

۱۳-۹
۳۱۸

جہاں میں خود پہنچنا چاہتا ہوں" ضیا چیخے عارف! یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ جانتے ہو وہ کون ہے؟ عارف نے ضیا کے بہت قریب ہو کر کہا" جانتا ہوں شاید تم سب سے زیادہ" ضیا لمحہ بھر تک تو حیرانی سے عارف کا منہ تکتے رہے اور پھر بولے" اچھا یونہی سہی ابھی کافی وقت ہے خوب اچھی طرح سوچ لو میں ہر طرح تمہاری مدد کو حاضر ہوں۔"

اگلے دن جب شمیؔ نئے کپڑے پہن کر ریشمی دوپٹہ اوڑھے اپنی کوٹھڑی سے نکلی تو نور میں نہائی ہوئی پری لگ رہی تھی میم صاحبہ کی تمام لڑکیاں دم بخود رہ گئیں ان کی ریشمی ساڑیاں ماند پڑ گئیں میم صاحبہ نے ناک چڑھائی اور وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ ضیا چلائے" ولڈن شمیؔ! اسے کہتے ہیں شان" عارف اپنی نئی اچکن پہنے جنگلے کے پاس تار پر ہاتھ رکھے سورج کی طرف دیکھ رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں بچے چلائے" عارف بھیا نے شمیؔ کو ریشمی دوپٹہ لا کر دیا ہے۔"

میم صاحبہ لال پیلی ہو رہی تھیں سب بہنوں کے منہ پھولے ہوئے تھے بھابیاں دل ہی دل میں کڑھ رہی تھیں ضیا عارف کو دیکھتے تھے مسکراتے تھے اور عارف مستقبل کے سنہرے خوابوں میں گم تھے۔ شمیؔ ضیا اور عارف کی گفتگو سن چکی تھی اس کی آنکھوں میں سنہری زندگی جھلک رہی تھی اس کی رفتار میں ایک حسین اور دلآویز تکبر تھا اس نے آنکھ اٹھا کر میم صاحبہ کو دیکھا نہ کسی اور کو ہاں نظر پڑی تو جنگلے کے پاس کھڑے ہوئے عارف پر شمیؔ کی آنکھوں میں وفورِ مسرت سے آنسو تیرنے لگے چاہتی تھی دوڑ کر عارف کے قدموں سے لپٹ جائے مگر یہ حسرت بھی نگاہوں تک محدود رہی بیچاری میم صاحبہ کو کیا خبر تھی کہ شمیؔ کا نشیمن کتنی بلندیوں میں گنگناتی ہوئی صبا کے دوش پر جھول رہا ہے اور عارف نے صحرا کے جس پھول کو انتخاب کیا ہے اس کی دوشیزہ مہک کتنی گراں بہا اور نایاب ہے

آپس میں ملتے ملاتے وقت لوگ کہتے تھے" بڑا دن مبارک ہو" اور شمیؔ سوچ رہی تھی یہ بڑا دن میری زندگی میں واقعی بہت بڑا دن ہے۔

# تصویر

خدا اگر کسی کو ایک نعمت سے محروم کرتا ہے تو اسکی تلافی دوسری نعمت سے کر دیتا ہے یہ بات پیٹرک کے حق میں سو فیصدی صحیح تھی وہ پانچ برس کی عمر میں اپنے والد کی سرپرستی سے محروم ہو گیا تھا لیکن خدا نے صبر و استقلال، خودداری و دانشمندی کے دروازے اس پر کھول دیئے تھے اسی لئے اس معصوم عمر میں ہی جبکہ اسکے کھیلنے کودنے کے دن تھے وہ ہر وقت اپنی غریب ماں کو آرام پہونچانا اور خوش رکھنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا منع کرنے کے باوجود گھر میں جھاڑو دیتا، برتن صاف کرتا اور گھر کے دیگر کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتا رہتا تھا۔ پڑوس کے بچوں کو امیرانہ ٹھاٹ میں دیکھ کر اسکے دل میں کبھی کسی قسم کا لالچ پیدا نہ ہوتا بلکہ ماں کے کبھی کبھی دیئے ہوئے پیسوں کو بھی وہ بڑی احتیاط سے رکھتا اور بوقت ضرورت خوشی خوشی پھر ماں کو واپس کر دیتا تھا۔

ایسٹر کا مہینہ تیزی سے آ رہا تھا۔ ماں نے تین چار مہینہ پہلے سے اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ پیسے بچا کر پیٹرک کے لئے ایک قمیص اور ایک پینٹ سلوا دی تھی۔ ایسٹر کی صبح اٹھ کر ماں نے اس کو تیار کر کے پیار کیا اور آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پی کر بولی "بیٹا مجھے تو گرجے جانے کی چھٹی نہیں ملی صاحب کے گھر گرجے کے بعد ہی کچھ لوگوں کی دعوت ہے مجھے تمام کھانا تیار کرنا ہے تو گرجے چلا جا اور وہاں گرجے میں شرارت نہ کرنا۔ خاموشی سے پادری صاحب کی باتیں سننا پھر مجھے آکر سنانا اور لے یہ آٹھ آنے ہیں سنبھال کر رکھنا۔

کل ایسٹر کا میلہ بھی ہے اسمیں خرچ کرنا۔" وہ ماما کو سلام کر کے چل دیا اور ماں کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو آنچل پر گر پڑے۔

وہ گرجے میں پہونچا وہاں بہت سے بچے زرق برق کپڑوں میں ملبوس بنچوں کے آس پاس پھدکتے پھر رہے تھے کسی کے ہاتھ میں غبارہ تھا۔ کسی کے سیٹی۔ کوئی لٹو لئے کھڑا تھا اور کوئی ربڑ کی گڑیا۔ اس نے ایک اچٹتی نظر ان بچوں پہ ڈالی اور آگے جاکر دری پہ بیٹھ گیا جہاں اس کی طرح کے تین چار بچے اور بیٹھے تھے۔ وہ دل میں سوچنے لگا کیسے بچے ہیں جو گرجے میں کھلونے لے کر آتے ہیں۔ ماما کہتی ہیں کہ گرجے میں خدا رہتا ہے اور یہ لوگ گرجے کو کھیلنے کی جگہ سمجھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد عبادت شروع ہوئی۔ جب پادری صاحب نے وعظ شروع کیا تو وہ بہت غور سے سنتا رہا کیونکہ اس کو گھر جاکر ماما کو سنانا تھا۔ یکایک اس کو خیال آیا یہ آرنک صاحب بھی کیسے آدمی ہیں خود تو سارے گھر کو لے کر آگئے اور میری ماما کو گرجے آنے کی چھٹی نہیں دی میں بڑا ہو جاؤں گا تو اپنی ماما کو روز گرجے بھیجا کروں گا۔ اس کے کانوں میں پادری صاحب کی آواز آئی "اپنے سارے بوجھ اسکی صلیب کے پاس لاکر ڈال دو وہ ہمارے سارے بوجھ لے کر صلیب پر چڑھ گیا اب ہم آزاد ہیں۔" وہ ان جملوں کا مطلب تو نہ سمجھ سکا لیکن اس نے ماما کو بتانے کی غرض سے وہ جملے یاد کر لئے۔

دوسرے روز ایسٹر میلہ تھا۔ ماں نے پیٹرک کو موٹی موٹی باتیں سمجھا کر میلے بھیج دیا کیونکہ ماں کو آج بھی چھٹی نہ ملی تھی امیروں کے گھروں پر تہوار کے وقت کام کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ میلے میں پہونچ کر اس نے چاروں طرف نظر ڈالی چھوٹی چھوٹی دوکانیں لگی ہوئی تھیں درمیان میں دو جھولے بھی تھے۔ وہ جھولوں کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور بڑی پُر شوق نگاہوں سے لوگوں کو اوپر نیچے جھولتے دیکھ کر خوش

ہونے لگا۔ مجبور انسان دوسروں کی خوشی سے خود کو خوش کر لیتا ہے اتنے میں اوپر سے کسی بچے نے پکارا "ارے پیٹرک آ۔ کیا تو نہیں جھولے گا بڑا مزہ آتا ہے آ جا بس دو آنے تو لگیں گے۔" اس کے دل میں آیا لپک کر جھولے میں بیٹھ جائے لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ جھولنے سے کیا فائدہ ذرا سی دیر کی خوشی کے لئے دو آنہ برباد کرنا کون سی عقلمندی ہے میری ماما نے کیسی محنت سے یہ پیسے کما کر مجھے دیئے ہیں۔ میں اس طرح فضول خرچی نہ کروں گا۔ وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب چاٹ اور دہی بڑوں کی دوکان تھی۔ سامنے آلو چاپ سموسے۔ پکوڑیاں اور نہ جانے کیا کیا رکھا تھا۔ دوکان کے سامنے خریداروں کی بھیڑ لگی تھی۔ چٹ پٹی چیزیں دیکھ کر اسکے منہ میں پانی بھر آیا اس کو کچھ کچھ بھوک بھی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا ایک آنہ کی چاٹ کھا لوں۔ جیب میں ہاتھ ڈالا "ارے پانچ ہی آنے تو ہیں ایک آنہ کی چاٹ کھا لوں گا تو صرف چار آنے ہی رہ جائیں گے اور ہاں اس روز ماما نے کہا تھا کہ چاٹ کھانے سے زبان چٹوری ہو جاتی ہے نہیں۔ نہیں چاٹ نہیں کھانا چاہیے اسنے پھر ایک مایوسانہ نظر تمام چیزوں پر ڈالی اور وہاں سے چل دیا دوسری دوکان پہ پہونچا۔ یہاں بوتلوں میں رنگ برنگے شربت رکھے تھے اور برف، گل رہا تھا اسنے قیمت پوچھی چار آنے ایک گلاس سن کر وہ حیران رہ گیا اتنا مہنگا وہ سنتے ہی قریب کے نل پر گیا اور گرم گرم پانی پی کر چلا آیا اب آئس کریم تھی۔ سفید سفید پیالیوں میں آئس کریم دیکھ کر یہ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا کہ یہ تو امیروں کے کھانے کی چیزیں ہیں۔

اب وہ کھلونوں کی دوکانوں پر آیا۔ یہاں ربڑ کی گڑیاں۔ غبارے۔ موٹریں۔ گیند اور سیٹیاں رکھی ہوئی تھیں وہ ایک ایک کھلونے کو اٹھا کر دیکھنے لگا ابھی جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ مسٹر بجن دوکاندار نے ڈانٹ کر پوچھا "کیا چاہیے تجھے یونہی تمام چیزوں کو الٹ پلٹ رہا ہے۔" یہ سنتے ہی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا گویا اسنے

کوئی بڑا قصور کر دیا ہے فوراً "کچھ نہیں" کہہ کر دکان سے ہٹ گیا۔ اب ایک ہی دوکان اور رہ گئی تھی یہاں ایک بڑی سی میز پر کچھ کتابیں اور تصویریں تھیں، وہ بڑے شوق سے لپکا اور ایک ایک تصویر کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اسے ایک تصویر ملی جس میں یسوع مسیح صلیب پر لٹکا ہوا تھا اور ایک عورت صلیب کے پاس بڑی سی گٹھڑی لئے کھڑی تھی تصویر دیکھتے ہی اس کو پادری صاحب کی بات یاد آگئی "اپنے سارے بوجھ اس کی صلیب کے پاس ڈال دو" اس نے تصویر ہاتھ میں لے لی، وہ سوچنے لگا کہ کیوں نہ اس کو خرید لوں ماما دیکھ کر کتنی خوش ہوں گی ہمارے گھر میں مسیح کی کوئی تصویر ہے بھی نہیں۔ ایسا بھی کیا گھر جس میں مسیح کی تصویر نہ ہو یسوع مسیح کی تصویر گھر میں ہو گی تو برکت ملے گی ہم لوگ اسی لئے تو اتنے غریب ہیں اس نے تصویر کو اپنے سینہ سے لگا لیا پھر مسٹر پال سے جن کی وہ دوکان تھی اس کی قیمت دریافت کی "چھ آنے" جواب ملا "چھ آنے" میرے پاس تو صرف پانچ آنے ہیں" اس نے مایوس ہو کر تصویر میز پر رکھ دی اور آگے بڑھنا چاہا مگر اسکے پاؤں آگے بڑھتے ہی نہ تھے اس نے پھر تصویر اٹھا کر اسے بغور دیکھا اب اسے ایسا محسوس ہوا گویا تصویر میں اسکی اپنی ماں کھڑی ہے جو اپنا سارا بوجھ صلیب پر پھینک رہی ہے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر پیسے گنے وہی پانچ آنے۔ پھر تصویر کو میز پر رکھ دیا اور آگے چلا۔ لیکن دو چار قدم چل کر پھر لوٹ آیا مسٹر پال جو اس کی ذہنی کشمکش کو دیکھہ رہے تھے اس سے مخاطب ہو کر بولے "کیا بات ہے بیٹا۔"

"یہ تصویر بہت اچھی ہے۔"

"تم لے لو۔"

"میرے پاس تو صرف پانچ آنے ہیں۔ ماما نے آٹھ آنے دیئے تھے۔ میں نے دو آنہ گرجا میں چندہ دے دیا۔ ایک آنہ فقیر کو دے دیا۔ اگر آپ یہ

تصویر مجھے دیدیں تو میں اپنی ماما سے ایک آنہ لاکر دے دونگا میں جھوٹ نہیں بولتا میری ماما مسٹر آئزک کے یہاں کام کرتی ہے ہمارے گھر میں یسوع مسیح کی ایک بھی تصویر نہیں ہے۔ اس تصویر کے ہونے سے میری ماما کو گرجے آنے کی چھٹی مل جایا کرے گی اور میری ماما کی غریبی بھی دور ہو جائے گی آپ کی بڑی مہربانی ہوگی یہ تصویر مجھے دیدیجیے۔"

بچے کی باتوں نے مسٹر بال کا دل پگھلا دیا۔ انہوں نے تصویر اٹھا کر پیٹرک کے ہاتھ پر رکھ دی اور کہا "یہ تصویر میں تم کو ایسٹر کا انعام دیتا ہوں پیسے بھی اپنے پاس رکھو۔"

"جی نہیں۔ میں بغیر پیسے دیے تصویر نہ لوں گا ماما نے کہا ہے کہ کوئی چیز کسی سے نہیں لینا چاہیے۔

جب پیٹرک اپنی ضد سے باز نہ آیا تو انہوں نے پیسے لے لیے تصویر حاصل کرکے پیٹرک کو جس قدر مسرت ہوئی اس کا بیان ناممکن ہے۔ وہ تصویر لیے سیدھا گھر پہونچا ماں دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی دوڑ کر اسے گلے لگایا اور میلے کی کیفیت پوچھنے لگی۔ پیٹرک نے بڑے لاڈ سے کہا "ماما میں آپ کے لئے بہت اچھی چیز لایا ہوں اب آپ کو کام دام کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ چلیے اندر چلیے۔"

جب دونوں اندر پہونچے تو پیٹرک نے کہا "آنکھیں بند کیجیے" ماما نے آنکھیں بند کر لیں۔ پیٹرک نے جیب سے تصویر نکال کر میز پر سجا دی۔ ماما نے آنکھیں کھولیں تو سامنے تصویر دیکھی "بیٹا میں نے تو تجھے کچھ کھانے کے لئے پیسے دیے تھے یہ تو کتنے میں لایا؟"

"پانچ آنے میں، ماما۔ ایک آنہ اُدھار کر آیا ہوں۔ دیکھیے نا یہ یسوع مسیح ہے پادری صاحب نے کل بتایا تھا کہ وہ ہمارے بوجھ لے کر صلیب پر چڑھ گیا

آپ بھی اپنے سارے بوجھ اس کی صلیب کے پاس ڈال دیجیے اب ہمیں کوئی بھی تکلیف نہ ہوا کرے گی۔ اب دیکھنا تھوڑے ہی دنوں میں ہم بھی دوسروں کی طرح امیر بن جائیں گے۔ خدا باپ ہمارے سب دکھ دور کر دے گا۔ میں اچھی چیز لایا ہوں نا؟"

"ہاں بیٹا بہت اچھی چیز ہے بہت اچھی"

اور ماما کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپکنے لگے۔

# سہیلی

ابھی مجھے اسکول میں داخل ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے کہ ایک اور نئی لڑکی گاؤں سے بورڈنگ میں آئی وہ چوتھی جماعت پاس کر چکی تھی مگر بچاری اردو بولتے بولتے پنجابی کے کئی الفاظ بول جاتی اور تمام لڑکیاں ہنسنے لگتیں۔ ایک دن وہ اپنے لکڑی کے بکس میں گردن ڈالے کھٹ کھٹ کچھ چبا رہی تھی میں اچانک کمرے کے سامنے سے گزری تو اسے اس حالت میں دیکھ کر رک گئی دو منٹ چپ چاپ کھڑی رہی پھر آگے بڑھی وہ میرے پاؤں کی آہٹ سن کر چونکی اور ایک دم بکس میں سے سر باہر نکالا اور کھٹ سے بکس بند کر دیا میں نے دیکھا وہ شرم کے مارے کانپ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر کوئی سفید سفید سی چیز لگی ہوئی تھی اس نے انتہائی شرم کی حالت میں اپنی آستین سے منہ صاف کیا اور پھر بمشکل حلق میں سے آواز نکالی۔ "ہائے بہن تم نے تو مجھے ڈرا دیا" اس نے ہنسنے کی کوشش کی مگر مسکرا بھی نہ سکی۔ میں نے پوچھا "بکس میں منہ ڈالے کیا کر رہی تھی؟" پہلے تو وہ جھجکی مگر پھر بڑے اطمینان سے بتانے لگی "گاؤں سے باجرے کے لڈو لائی تھی وہ کھا رہی تھی، میں لڑکیوں کے سامنے تو کھا نہیں سکتی سب مانگنے لگتیں یا پھر مذاق اڑاتیں اس لئے اکیلے میں چھپ کر کھا رہی تھی" باجرے کے لڈوؤں کی بات سنتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ بورڈنگ میں بھوک بہت لگتی ہے میں نے دل میں سوچا یہ سیدھی سادی لڑکی ہے اسے

سہیلی بنا لینا چاہیئے۔ اور کچھ نہیں تو یہ باجرے کے لڈو تو کھانے کو مل جائیں گے۔ میں نے اسکے قریب ہو کر بڑے رازدارانہ لہجہ میں کہا "بڑا اچھا کیا تو نے کسی کو نہیں بتایا کہ تیرے پاس کوئی کھانے کی چیز ہے نہیں تو اب تک کوئی لڑکی ضرور چرا لیتی مگر دیکھ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی ...... کیسے ہوتے ہیں یہ باجرے کے لڈو؟" وہ فوراً بکس کی طرف مڑی اور جلدی سے بکس کھول کر ایک لڈو نکالا آدھا مجھے دیا اور آدھا خود کھانے لگی "بہن دروازہ بند کر دو کوئی لڑکی نہ آ جائے" میں نے کہا "فکر نہ کر سب کی سب سکول ہال میں سٹڈی کر رہی ہیں" غرض یہ ہوا کہ وہ میری پکی سہیلی بن گئی اور ہم نے مل کر خوب مزے اڑائے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی اچھے کھاتے پیتے گھر کی لڑکی ہے شکل وصورت کی تو خیر اتنی اچھی نہیں تھی مگر خوب صحت مند تھی اتنی سیدھی تھی کہ لڑکیاں اسے بدھو کہنے لگیں چند مہینوں بعد اسے خوب اچھی طرح اردو بولنا آگیا اور کپڑے پہننے کا ڈھنگ بھی آگیا اس کی سیدھی سادی باتوں کی وجہ سے میں اسے بہت ہی پسند کرتی تھی اور وہ میری سب سے زیادہ عزیز سہیلی تھی۔

ایک دفعہ سکول میں ایک مسیحی سادھو آئے وہ ہر شام لڑکیوں کی ایک میٹنگ کرتے اور ہمیں اچھی اچھی باتیں بتاتے ان کے کلام کا اتنا اثر ہوا کہ اکثر اوقات دعا کرتے کرتے لڑکیاں رونا شروع کر دیتیں اور خوب روتیں جب دیکھو انجیل پڑھی جا رہی ہے دعائیں مانگی جا رہی ہیں تمام بورڈنگ میں نئے دور کا آغاز ہوا اور سچ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی تمام لڑکیاں بدل گئی ہیں۔ میں تو خیر شروع ہی سے شریر لڑکی تھی اس لئے زیادہ متاثر نہ ہوئی مگر میری سہیلی کی عجیب حالت ہو گئی وہ ہر وقت انجیل پڑھتی رہتی اور اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا سادھو جی چلے گئے مگر پھر بھی لڑکیوں پر ابھی تک روحانی اثر قائم تھا یہاں تک مشہور ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کو فرشتے

نظر آتے ہیں میں ایسی باتیں سنتی اور خوب ڈرتی اور حقیقت یہ تھی کہ ڈر کے مارے میری تو راتوں کی نیند بھی غائب ہونے لگی۔

جب بہت سی لڑکیاں اپنی پہلی حالت پر واپس آ رہی تھیں میری سہیلی پر ایک عجیب قسم کا جنون طاری ہوا بہت سی لڑکیوں نے اسے آدھی آدھی رات کو اٹھ کر دعا مانگتے دیکھا بلکہ یہاں تک مشہور ہو گیا کہ وہ رات کو اٹھ کر باہر سکول کے چیپل کی سیڑھیوں پہ سر جھکا کر کئی کئی گھنٹے دعا مانگتی ہے اس کی عجیب حالت ہو گئی تھی لڑکیوں سے بہت کم بات کرتی تھی سب استانیاں اسکی نسبت عجیب عجیب باتیں کرتیں بلکہ ایک کا خیال تھا کہ اسے کوئی روح چمٹ گئی ہے میرے لیے اسکا پیار اور بھی بڑھ گیا تھا مگر میں تو اس سے نظر ملاتے ڈرتی تھی وہ مجھے اچھا بننے کی ہدایت کرتی اور میرے لیے دعا کرتی مگر میں تو تھی ہی شریر بھلا مجھ پر کیا اثر ہوتا۔

سردیوں کے دن تھے اور ہم اپنے کمروں میں بند ہو کر سویا کرتے۔ میری سہیلی میرے کمرے میں تھی اور میرے ہی نزدیک اس کی چارپائی تھی ایک رات اس نے مجھے جگایا میں ڈر گئی اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا میری روح فنا ہونے لگی مگر جانے مجھے کیا ہو گیا میں چپ چاپ اٹھ گئی اس نے انجیل اٹھائی مجھے لالٹین اٹھانے کو کہا میں لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بمشکل لالٹین اٹھا سکی اس نے چپ چاپ دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی چاند نکلا ہوا تھا سب لڑکیاں بے خبر سو رہی تھیں میں نے روشنی میں اس کے چہرے پر نظر ڈالی ایک عجیب قسم کا نور پھیلا ہوا تھا اور میرے قدم خود بخود اس کے پیچھے پیچھے اٹھتے چلے گئے چیپل کا دروازہ بند تھا وہ سیڑھیوں کے قریب رک گئی اور میرے ہاتھ سے لالٹین لے کر بیٹھ گئی پھر اسکے ہونٹ زور زور سے ہلنے لگے اسکا تمام بدن کانپنے لگا اور اسکے چہرہ کی روشنی تیز سے تیز تر ہوتی گئی میں نے گھبرا کر آنکھیں

بند کرلیں اور وہیں سر جھکا کر بیٹھ گئی وہ میرے قریب سرک آئی میرے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مجھ پر جیسے لرزہ طاری ہوگیا اور میں انتہائی خوف کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی۔

صبح کو رات کا واقعہ محض ایک خواب معلوم ہوتا تھا میری گردن پر ایک سیاہ داغ بچپن سے تھا اور میری حیرانی کی حد نہ رہی کہ وہ غائب تھا میں نے اپنی سہیلی سے اسکا ذکر کیا وہ مسکرائی اور کچھ نہ بولی اس واقعہ کے بعد میری شرارتیں جاتی رہیں اور میں بہت اچھی لڑکی بن گئی۔

ایک دفعہ میری انگلی چاقو سے کٹ گئی اور میں نے اسے ہاتھ لگانے کو کہا اس نے مسکرا کر میرا ہاتھ چھوا اور میں بالکل ٹھیک ہوگئی اس دن بے اختیار ہوکر میں اس سے لپٹ گئی مجھے رونا بھی آگیا میں نے یہ بات اور اس دن کی رات والی بات کسی کو نہیں بتائی پھر عجیب قصہ ہوا اسے نمونیہ ہوگیا اور وہ علیحدہ ایک کمرے میں بھیج دی گئی ڈاکٹر نے کہا اس کی حالت نازک ہے پرنسپل نے اسکے باپ کو تار دیا اگلے دن جب وہ آیا تو یہ بات سن کر حیران رہ گیا کہ گزشتہ رات وہ چیپل کی سیڑھیوں پر مردہ پائی گئی اس کی انجیل نزدیک ہی کھلی پڑی تھی اور لالٹین جل رہی تھی۔

# منزل

نرس!!! جیکب نے کمزور آواز میں پکارا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ نرس جا چکی تھی دسمبر کی سخت سردی سے اسکا جسم بالکل ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا۔ سامنے کی کھڑکی سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی اور اسکا رواں رواں سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے کمبل کو اپنے چاروں طرف مضبوطی سے لپیٹ لیا اور ایک سرد آہ بھری اس کی نظر سامنے کے ایک فریم پر پڑی جس میں اس کی جوان بہن . . . . میری اور اسکی دوست کرونا کی تصویر تھی اور وہ اس تصویر کو اس طرح گھورنے لگا جیسے یہ اس کے لئے بالکل نئی چیز ہے اسکی نظریں تصویر سے ہٹ کر کھڑکی سے باہر کی فضا میں اپنے ماضی کے ماحول کو تلاش کرنے لگیں۔

اسے کالج کی وہ رنگین فضا یاد آ گئی جہاں اس نے اپنی جوانی کے دن عیش و عشرت میں گزارے تھے وہ اپنے کالج میں بطور شاعر مشہور تھا اور شکل صورت کے لحاظ سے کالج کا ہیرو مانا جاتا تھا اور اسکے اس دلکش حسن کی وجہ سے کتنی لڑکیاں اس کے نزدیک تر ہونے کی کوشش کرتی تھیں مگر اس نے کبھی کسی کو اپنے لائق نہ سمجھا جب وہ بی۔ اے میں آیا تو اسکی زندگی نے پلٹا کھایا شرارتوں میں اسے مزہ آنے لگا وہ ہر لڑکی سے مذاق کرتا بہت سی لڑکیاں اس کی زندگی میں داخل ہوئیں اور چلی گئیں مگر کوئی بھی اسے اپنا نہ سکی اور جیکب نے بھی کسی کی ضرورت محسوس نہ کی اور پھر اسکی زندگی میں کرونا

داخل ہوئی جس کی حسین آنکھوں میں اسے ایک پرشکوہ اطمینان جھلکتا ہوا نظر آتا تھا مگر جیکب کو یہ معلوم کر کے کافی تکلیف محسوس ہوئی کہ کرونا اپنا زیادہ وقت اپنے مذہبی مشاغل میں صرف کرتی ہے اتوار کو جب پورے کالج میں چھٹی ہوتی تھی اسے چرچ جانا پڑتا اور بچوں کا سنڈے اسکول بھی لینا پڑتا تھا اس لئے وہ سیر وسیاحت میں جیکب کا ساتھ نہ دے سکی مگر اسے یہ معلوم کر کے بڑا رنج ہوتا تھا کہ جیکب مذہب کو قید سمجھتا ہے اور مذہب کا پابند نہیں ہے کرونا نے بہت چاہا کہ جیکب کو مذہب کی غیرت دلائے اور اسے مذہب کا پابند بنا دے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

ایک دن کرونا جیکب کا کمرہ صاف کر رہی تھی اس نے دیکھا کہ جو بائبل اسنے انعام میں اسے دی تھی وہ الماری میں سب سے نیچے کے خانہ میں رکھی ہوئی ہے اس نے بائبل کو وہاں سے اٹھایا اور اپنے سینہ سے لگا لیا اور خاموشی سے وہاں سے چلی گئی اور کئی دن تک جیکب سے نہ مل سکی۔ جیکب بی اے میں فیل ہو گیا اور کرونا کو اسکا بہت غم ہوا وہ جانتی تھی کہ جیکب کی نیچر ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ کبھی بھی اپنی زندگی کو سدھار نہ سکے گا۔

مسیحیوں کا سب سے بڑا تہوار یعنی بڑا دن آیا سب خوش تھے اور خاص کر جیکب کیونکہ اسے کھانے کی ہر اچھی چیز اور پینے کو شراب میسر تھی اور آج نہ معلوم وہ کتنے عرصہ کے بعد چرچ گیا تھا اس نے وہاں بہت سی لڑکیوں میں کرونا کو سفید لباس میں ملبوس دیکھا اور چرچ ختم ہونے پر اس نے کرونا سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ اسے نہ مل سکی اور اس دن جیکب نے ایک خاص کمی محسوس کی مگر وہ جلد ہی اپنے دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ شام کے وقت جیکب اور اس کے دوست کمرے میں بیٹھے تھے دروازہ بند تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور کرونا اندر داخل ہوئی جیکب نے دیکھا کہ کرونا کچھ

اداس سی ہے اور اس کی آنکھوں سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے اسکے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب تھی اور اس نے جیکب سے کہا "دیکھو جیکب میں دنیا کی سب سے بڑی دولت آج تمہیں انعام میں دے رہی ہوں تم اسے ہر روز پڑھا کرنا اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا تمہیں معلوم ہو کہ میں جنوری میں کچھ سال کے لئے یہاں سے بہت دور مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جا رہی ہوں اور یہ میری آخری خواہش ہے کہ تم اس کتاب کو پڑھو اور جب میں واپس آؤں تو تمہیں اپنے مذہب کا ایک غیرتمند جوان پاؤں۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم یہ میری آخری خواہش پوری کرو گے" اور اسوقت کرونا کی حسین آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا اور جیکب اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتا رہا اس نے کتاب کرونا کے ہاتھ سے لے لی اور اس کو بکس میں رکھ لیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کرونا جا چکی تھی۔

دن گزرتے گئے اور کرونا امریکہ چلی گئی جیکب نے کچھ دن اس کی کمی کو محسوس کیا اور پھر شاعری شراب اور اسکے دوستوں نے تمام پرانی باتوں کو اس کے ذہن سے محو کر دیا۔ دو سال کے طویل عرصہ کے بعد ایک دفعہ جیکب سخت بیمار ہو گیا اور اپنے گھر چلا آیا۔ بیماری نے یہاں تک طول پکڑا کہ وہ تپ دق کا مریض بن گیا اور سناٹوریم میں آ گیا اس کی زندگی نہایت ہی بے کیف ہو گئی تھی۔

---

باہر چاند اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا جیکب نے اپنی نظریں کھڑکی سے ہٹائیں اسے اپنے ماحول سے خوف سا آنے لگا وہ اس وقت بالکل اکیلا تھا وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے آج اپنے جسم میں کچھ زیادہ طاقت محسوس ہوئی اسنے کیلنڈر دیکھا آج دسمبر کی چھبیس تاریخ تھی اس نے اٹھ کر بکس کھولا اور اس میں سے ایک کتاب نکالی جو کرونا نے اسے دی تھی اس نے کتاب کو سینے سے لگا لیا اسے

راحت سی محسوس ہوئی اس نے کتاب کو پڑھنا شروع کیا وہ پڑھتا گیا رات کی تاریکی ہٹتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی زندگی کی تاریکی بھی۔ اور سویرا ہونے والا تھا اسے سخت سردی محسوس ہو رہی تھی اسے نیند آنے لگی کیونکہ وہ کئی راتوں سے سو نہ سکا تھا آج وہ راحت سے سونا چاہتا تھا اس نے کتاب کو بے اختیار چوم لیا اور اس کو روشنی سی دکھائی دی اور وہ اس روشنی کی طرف بڑھتا گیا اور اس کی روح اس کے جسم ناتواں سے نکل کر آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر گئی۔

اور صبح ہی صبح میری اور کرونا جو مدت سے جیکب سے بچھڑی ہوئی تھیں ملنے کے لئے اس کے کمرے میں آئیں مگر...... وہاں صرف جیکب کا مردہ جسم تھا جس پر پاک کلام کھلا رکھا تھا اور اس کی روح ابدی اطمینان کی تلاش میں آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر گئی تھی کرونا اس بے جان جسم سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے نہ رکنے والا سیلاب بہ نکلا۔

دور کہیں گرجے کے گھنٹے بج رہے تھے لیکن ایک بھٹکی ہوئی جوانی پہلے ہی اپنی منزل پر پہنچ چکی تھی۔

# گزرتے سائے

"میں بپتسمہ لینا چاہتا ہوں آج میں مسیحی ہونا چاہتا ہوں پادری صاحب" جوزف نے سنجیدگی سے کہا۔۔۔ "آج میری زندگی کا بہترین دن ہے!"

"مگر تم تو عیسائی ہو بھائی!" پادری صاحب نے جوزف کی طرف دیکھتے ہوئے حیرانی سے کہا۔

ہاں پادری صاحب میں عیسائی ضرور ہوں اس لئے کہ میرا باپ عیسائی تھا میرا تمام خاندان عیسائی ہے عیسائیت مجھے ورثہ میں ملی ہے مگر آج میں ایک حقیقی مسیحی ہونا چاہتا ہوں میں نام کا مسیحی نہیں رہنا چاہتا میں مسیح کی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ پادری صاحب جب میں بچہ تھا میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ عیسائی ہونے کی حیثیت سے شاید میں بہشت میں پہونچ جاؤنگا گویا عیسائیوں نے بہشت میں جانے کا ٹھیکہ لے لیا ہے مگر آج مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دنیا والوں نے مذہب کو محض ایک ڈھکوسلہ بنا رکھا ہے کیا جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تھا تو کہہ دیا تھا جا تو عیسائی ہے یا تو ہندو ہے یا مسلمان تو پھر آج عیسائی یہ کیوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ جنت کے وارث تو صرف ہم ہی ہیں مگر یہ سب ہماری کوتاہ اندیشیوں کی نشانیاں ہیں اور میرے مصنوعی دماغی ایمان کا پردہ آج حقیقت کے آہنی ہاتھوں سے چاک ہو گیا ہے اور میں نے اپنے مسیحی کی بدولت حقیقت کی روشنی دیکھ لی ہے اور اسی لئے میں بپتسمہ لینے آیا ہوں۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے جوزف مگر تم ایک عیسائی ہو اور عیسائی صرف ایک ہی دفعہ بپتسمہ لیتا ہے وہ بپتسمہ تم بچپن میں لے چکے ہو" پادری صاحب نے جوزف کے کندھے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا بچپن میں ایک ناسمجھ بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر چند کلمے پڑھ دینے سے آپ اسے مسیح کی بادشاہت میں داخل ہونے کا ٹکٹ دیدیتے ہیں کہ اسے دوبارہ سمجھدار ہو کر بپتسمہ لینے کی ضرورت ہی نہ پڑے یہ بھی ایک غلط فہمی ہے جو اکثر عیسائیوں کے دلوں میں ہے۔"

پادری صاحب حیران تھے کہ یہ نوجوان جو ایک پادری کا بیٹا ہونے کے باوجود بھی ایک بدچلن آوارہ اور شرابی ہے آج کیونکر اس قسم کی باتیں کر رہا ہے گویا پادری کے بیٹے کا بدچلن ہونا کوئی بڑی عجیب بات ہے اور وہ حیرت سے جوزف کی طرف دیکھنے لگے گویا وہ اسکے دل کا حال معلوم کرلیں گے۔

جوزف پادری صاحب کی حیرانی کو خوب سمجھتا تھا۔ "آپ حیران ہیں پادری صاحب آپ کو حیران ہونا بھی چاہیے آج ایک بدچلن نوجوان آپ کے پاس آکر نئے سرے سے اپنی زندگی کو تبدیل کرنا چاہتا ہے سنیئے میں خود ہی تمام واقعات آپ کو بتاتا ہوں"

---

دو سال ہوئے یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں میٹرک کا امتحان دے کر اپنے بھائی کے پاس دہلی میں آگیا تھا امتحان کا بوجھ سر پر سے اتر چکا تھا مجھے ہر طرف سے فرصت ہی فرصت تھی میں شروع ہی سے بری صحبت میں پڑ چکا تھا میرے لئے جھوٹ بولنا اور چوری کرنا عام بات تھی یہ باتیں میری عادت میں اس طور سے بس گئی تھیں کہ ان کے بغیر زندگی خشک اور ادھوری معلوم ہوتی تھی۔

ایک دن میں اپنی چارپائی پر اوندھا لیٹا ہوا غالب کی ایک غزل گنگنا رہا تھا۔

باہر کا دروازہ آہستہ سے کھلا ایک دبلی پتلی لڑکی اندر داخل ہوئی، لڑکی نہیں پادری صاحب بلکہ میرے نزدیک اب وہ ایک فرشتہ ہے جس نے آج میری زندگی کو تبدیل کر دیا اسکا نام ایلیس تھا مجھے پہلی ہی ملاقات میں ایلیس سے کچھ محبت سی ہو گئی وہ ہمارے یہاں اکثر آیا کرتی تھی اکثر میں گھر پر اکیلا ہوتا تھا اور وہ آجاتی ہم گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے میں اکثر سینما اور ہوٹلوں کی تعریف کیا کرتا اگر میں ان کے حق میں کچھ کہتا تو وہ انکی برائیاں بیان کرتی وہ مجھے ہمیشہ گرجے جانے پر مجبور کرتی اور میں اس کو سینما دیکھنے پر مجبور کرتا اسی کشمکش میں ایک ماہ گزر گیا ایلیس سب سے پہلی لڑکی تھی جس کو میں نے اپنی زندگی کی دنیاوی منزل سمجھ لیا تھا اور میں نے بارہا محسوس کیا کہ اسکو بھی مجھ سے بے انتہا محبت ہے میں اکثر دوستوں کے ساتھ سینما جاتا تھا مجھے وہاں ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں ہنستا ہوں لیکن ایک دم میرے ذہن میں ایلیس کا تصور آجاتا۔ میں اکثر اسے اسکول کے راستے میں ملتا مگر وہ صرف مسکرا دیتی شاید وہ راستے میں کھڑے ہو کر بولنا پسند نہ کرتی ہو ایک دفعہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ سینما گیا مگر میں بہت جلد شو ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلا آیا میں نے ایلیس کی کمی کو پورے طور سے محسوس کیا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلی دفعہ پکچر دیکھنے آؤں گا تو ایلیس میرے ساتھ ہو گی" یہ کہہ کر جوزف خاموش ہو گیا اور باہر فضا میں دیکھنے لگا گویا کچھ تلاش کرنا چاہتا ہے، باہر رات کی سیاہی کا شباب تمام کائنات اور ستاروں کی جگمگاتی دنیا پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اندھیرے میں کہیں دور روشنی کی ایک کرن ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل کا پتا دے رہی تھی اسکے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور جوزف کو اپنی منزل قریب تر دکھائی دینے لگی۔

پادری صاحب اس طویل خاموشی سے چونک پڑے "پھر کیا ہوا جوزف؟" انہوں نے ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا۔

جوزف نے پادری صاحب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں جس پر بڑھاپے کی وجہ سے جھرّیاں پڑ گئی تھیں مگر سفید داڑھی اور چمکیلے بالوں سے ایک نور برستا تھا جوزف نے پادری صاحب کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے ہمدردی کی ایک جھلک دکھائی دی۔

جوزف نے پھر کہنا شروع کیا: "اور میں دوسرے ہی دن ایلس کو اسکول سے گھر آتے ہوئے راستے میں ملا۔ وہ مسکرائی مجھے جرات نہ ہوتی تھی کہ ایلس کو پکچر دیکھنے کے لئے کہہ سکوں۔ پھر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا کہ وہ اتوار کو میرے ساتھ سینما چلے۔

"اتوار کو.... پکچر دیکھنے؟"... ایلس نے حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا آپ اتوار کو بھی پکچر دیکھتے ہیں؟"

"نہیں نہیں اتوار کو تو نہیں" حالانکہ میں ہر اتوار کو پکچر دیکھا کرتا تھا مگر میں نے صاف جھوٹ بولا وہ جب بھی مجھے اپنے ساتھ گرجے چلنے کو کہتی تو میں فوراً ٹال دیتا ایلس بالکل خاموش کھڑی تھی۔ میری بنائی ہوئی اسکیم کے محل کی بنیادیں ہلنے لگیں اچانک مجھے ایک مکارانہ اسکیم سوجھی۔

میں نے کہا "بڑے بھائی کی لکھنؤ سے چٹھی آئی ہے انہوں نے مجھے بلایا ہے جانے سے پہلے میں نے سوچا تمہارے ساتھ ایک پکچر دیکھ جاؤں، مگر خیر.... میں نے ایک ہی خواہش کی تھی...... ویسے تم نے....." ایلس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آگئی اس نے ایک بار میری طرف دیکھا پھر اپنی مرضی کے خلاف کہہ دیا۔

"ایک شرط ہے....."

"وہ کیا؟" میں نے نہایت ہی اشتیاق بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"اگر آپ اس اتوار کو میرے ساتھ گرجے چلیں تو میں آپ کے ساتھ سوموار کو پکچر دیکھنے چلوں گی۔"

شاید اس نے کبھی پکچر نہ دیکھی تھی پھر اپنے ماں باپ کی اجازت کے بغیر وہ کیسے جا سکتی تھی؟ لیکن میں نے یہ شرط خوشی خوشی منظور کر لی۔ اتوار کو میں اور وہ چرچ میں ایک بنچ پر بیٹھے وہ بالکل میرے پاس بیٹھی تھی ہم دونوں ایک ہی گیت کی کتاب دیکھ رہے تھے وہ گیت گا رہی تھی اور میں خاموش کھڑا تھا اگر کوئی فلمی گیت ہوتا تو شاید میں خوب زور سے گاتا۔

ایلس مجھ سے پوچھنے لگی "آج عشاء ربانی[1] کا دن ہے آپ عشاء ربانی لینگے؟"

میں نے کہا "تم لوگی کیا؟"

کہنے لگی "ہاں" میں نے بھی بغیر سوچے سمجھے ہاں کہہ دیا گویا ایک معمولی سی بات تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا یہ لڑکیاں بھی کتنی مکار ہوتی ہیں ویسے تو عشاء ربانی لینے آ رہی ہیں مگر انکے دل میں کیا کچھ بھرا ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے اور بھی جتنے لوگ بیٹھے تھے مجھے ان کے چہروں سے نفرت سی ہونے لگی کتنے ریاکار ہیں یہ لوگ کاش میں گرجے آنے کے بجائے پکچر چلا جاتا کم از کم ان مکار اور ریاکار لوگوں کے چہرے تو نہ دیکھتا، پادری کو تنخواہ ملتی ہے اور وہ لکچر دیتا ہے اس کا دل صاف نہیں محض روپیوں کی خاطر وہ دعا کرتا ہے لوگوں کو گناہوں سے توبہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے کیا اس کا دل صاف ہے؟ لڑکے لڑکیاں محض شغل کی خاطر گرجے آتے ہیں کیا انکے دل صاف ہیں؟ کیا وہ واقعی خدا کا کلام سننے آتے ہیں؟ اور یہ سفید سفید داڑھیوں والے بزرگ جنہوں نے شاید ساری زندگی گناہ میں گزاری تھی آج خدا کو دھوکا دینے کی خاطر گرجے آ گئے ہیں میں نے اس وقت اپنے آپ کو ان لوگوں سے بالاتر محسوس کیا میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر باہر چلا جاؤں مگر اگلے دن کا پکچر کا وعدہ یاد آ گیا اور میں مجبوراً

---

[1] مسیح کی موت کی یادگاری میں انگور کے شیرہ اور روٹی کی تقسیم عشاء ربانی کہلاتی ہے۔

بیٹھا رہا۔

جماعت کھڑی گیت گا رہی تھی اور میں بیٹھا ہوا اپنے خیالات میں مگن تھا۔ اچانک اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں جلدی سے کھڑا ہو گیا میرا جی چاہتا تھا کہ زور زور سے ہنسوں اور ان مکار اور ریاکار لوگوں پر قہقہے لگاؤں۔ گیت ختم ہو چکا تھا اور ہم بیٹھ گئے اسکے بعد عشاء ربانی شروع ہوئی ایلس دعا مانگنے میں مشغول تھی دعا مانگنے کے بعد وہ عشاء ربانی لینے چلی گئی میرے دل میں بھی عشاء ربانی لینے کی ایک دبی دبی سی خواہش پیدا ہوئی اور میں بغیر سوچے سمجھے اٹھ کر چلا گیا میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہے جس کی تلافی غیر ممکن ہے جب میں عشاء ربانی لے کر پلٹا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں کسی نامعلوم بوجھ سے دبا جا رہا ہوں جب میں اپنی جگہ واپس آیا تو ایلس جا چکی تھی عبادت ختم ہونے کے بعد میں بھی گھر چلا آیا گھر پہنچا تو بڑے بھائی کا تار ملا لکھا تھا فوراً آجاؤ۔ مجھے فوراً اپنا جھوٹ یاد آگیا جو میں نے ایلس سے بولا تھا میں نے لکھنؤ جانے کا ارادہ کر لیا اور اسی پریشانی میں ایلس سے بھی ملاقات نہ ہو سکی مجھے ایلس پر بہت غصہ آ رہا تھا سینما کا وعدہ کر کے بھی وہ مجھے نہ ملی جس دن مجھے جانا تھا اچانک اس دن وہ ہمارے گھر آئی مجھے دیکھتے ہی مسکرائی میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور جلد ہی ملنے کا وعدہ کیا دہلی سے جانے کو دل نہ چاہتا تھا کیونکہ میں ایلس کی جدائی ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا مگر مجبوراً مجھے دہلی کو چھوڑنا ہی پڑا۔

لکھنؤ پہنچ کر کئی دن تک مجھے بہت برا لگا، مگر پھر سینما ہوٹل اور شراب کی سرگرمیوں میں ایلس کو بھول گیا، لیکن کبھی کبھی ایلس بے اختیار یاد آجاتی اس کے خطوط اکثر میرے پاس آتے رہتے تھے مگر میں کبھی کبھار ہی جواب دیتا کیونکہ میرے دل میں اب اس کے لئے کوئی خاص محبت نہ تھی۔ اچانک ایک دن مجھے اسکا ایک خط ملا جس میں

اس نے مجھے اپنی شادی کے متعلق لکھا تھا اور شادی میں آنے کی دعوت دی تھی خط پڑھتے ہی میرے جسم میں آگ سی لگ گئی پھر مجھے اس دن گرجے والا وہی منظر یاد آگیا اور میں ایک مسیحی ہوتے ہوئے بھی مسیحیوں سے نفرت کرنے لگا اس نفرت کے جذبہ کی وجہ سے میرا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔"

اسکے بعد جوزف پھر رک گیا اور باہر اندھیرے میں اس روشنی کی کرن کو دیکھنے لگا جو دور ایک بھولے بھٹکے مسافر کو اپنی منزل کا پتا دینے کے لئے ٹمٹما رہی تھی اور جوزف چاہتا تھا کہ بھاگ کر اس روشنی تک پہنچ جائے، اس نے پھر کہنا شروع کیا " دو سال بعد میرا تبادلہ لکھنؤ سے دہلی ہو گیا نفرت کے باوجود میرے دل میں ایلس کے لئے کچھ ہمدردی بھی تھی آج ہی صبح کو میں واپس لوٹا ہوں میں صرف ایک دفعہ ایلس کو دیکھنا چاہتا تھا میں ابھی تک نہ سمجھ سکا تھا کہ یہ خواہش کیوں میرے دل میں پیدا ہوئی تھی لیکن پھر بھی میں ایلس کو دیکھنا چاہتا تھا اور میں آج دو سال کے بعد پھر اسی چرچ میں گیا آج پھر عشاء ربانی کا دن تھا اور مجھے پھر وہی دن یاد آگیا عشاء ربانی شروع ہو گئی اور مجھے محسوس ہو رہا تھا گویا ایلس گرجے کے کسی حصہ میں بیٹھی میرے لئے دعا کر رہی ہے اور میں کسی نامعلوم جذبہ کے تحت عشاء ربانی لینے اٹھا مگر آج میں کانپ نہیں رہا تھا میں نے بڑی تسلی سے عشاء ربانی لی آج پھر میں نے ایک بوجھ سا محسوس کیا مگر آج اس کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ تھا گرجا ختم ہونے کے بعد میں باہر نکلا اور میں نے دور سے ایلس کو پہچان لیا وہ میری طرف کھنچی چلی آئی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا اس نے بچے کو میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا یہ تمہارا بچا کا ہے بچا بچا ..... مجھ پر بجلی سی گری اور مجھے محسوس ہوا گویا مجھے کسی نے بہت بلندی سے نیچے دھکیل دیا ہو۔ میں نے جونہی بچے کو گود میں لے کر پیار کیا تمام گلے شکوے جو مجھے ایلس سے تھے ختم ہو گئے۔ میں نے اس کی محبت کو غلط سمجھا اور میرا سر شرم سے جھک گیا

میں نے اسکے چہرے کی طرف دیکھا وہ ایک دیوی کی طرح نظر آرہی تھی میرا بوجھ حد سے زیادہ بڑھ گیا اب میں آپ کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ میرے بوجھ کو اتار کر ایک نئی زندگی شروع کرنے میں میری مدد کریں ؟

پادری صاحب نے اطمینان کا ایک سانس لیا اور جوزف کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگنے لگے جوزف کو یوں محسوس ہوا گویا تمام بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے پادری صاحب کی دعا نے جوزف کے تمام بوجھ کو اتار کر پھینک دیا تھا جوزف نے باہر جاکر خلا میں دیکھا تارے ابھی تک جھلمل جھلمل کر رہے تھے مگر ایک روشنی جوزف کو اپنے قریب آتی ہوئی معلوم ہوئی وہ اپنی منزل پر پہونچ چکا تھا اور اس کی روح افق کی طرف پرواز کرتی ہوئی خوشیوں کے ترانے گا رہی تھی ۔

# چوتھا موڑ

"میری زندگی! تم سو جاؤ اور آرام کرو۔ تمہاری حسین پلکیں نیند سے بوجھل دکھائی دے رہی ہیں۔"

"میرے جیون۔ میرے سرتاج۔ میں سو نہیں سکتی۔ جب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تو مجھے کیسے نیند آئے گی۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ـــــ ریکھا۔"

"آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں ریکھا۔ یونہی کبھی کبھی پرانی یادیں جو دبی چنگاریوں اور ابھرتے ہوئے زخم کی طرح ہوتی ہیں جاگ کر بہت بے چین کرتی ہیں۔"

"بھول جائیے ایسی باتوں کو۔ آپ خواہ مخواہ پرانی یادوں کو لے بیٹھتے ہیں۔"!

"ریکھا ویسے تو تمہیں دیکھ کر سب کچھ بھول جاتا ہوں اپنی تنہائیاں اور تنہائیوں میں بے چین کرنے والی یادیں لیکن پھر بھی فضول سی باتیں دماغ میں کھٹکتی ہیں اور پریشان کرتی ہیں۔ جب میں اپنی زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پیچھے بہت دور تک کچھ زندگیاں نظر آتی ہیں جنہوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لیکن جب تمہیں دیکھتا ہوں۔ تو سب کچھ بھول جاتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ تم میری آنکھوں میں بسی رہو تاکہ یہ بیہودہ باتیں مجھے پریشان نہ کریں۔"

"میں بھی تو جانوں کیا ہیں وہ یادیں اور بے ہودہ باتیں جو آپ کو پریشان کرتی ہیں ۔۔"

"میری زندگی ! برا تو نہ مانو گی؟ ۔۔"

"میرے چاند ہرگز نہیں۔ جب آپ میرے ہیں تو میں کیوں برا مانوں گی بلکہ ہر کوشش کروں گی کہ آپ ان بیہودہ باتوں کو بھول جائیں۔"

"تو سنو میں اپنی زندگی کے تین بھرتے ہوئے زخم پھر سے کریدتا ہوں ۔۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک کرسچین کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک شام جونہی میں تیز تیز قدموں کے ساتھ گھر سے چرچ کیلئے نکلا تو راخل مجھے مل گئی۔ یہ وہی راخل تھی جس سے ایک ماہ پہلے میرے تعلقات کا آغاز ہوا تھا میں اگرچہ ایک کالج لیکچرار تھا اور وہ بھی ایک لیکچرار اسسٹنٹ۔ لیکن میں نے ان سب باتوں کو ذہن سے جھٹک کر مسیحی ہونے کے ناطے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مس راخل گڈ ایوننگ ۔۔"

"گڈ ایوننگ پروفیسر صاحب ۔۔" اس نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"آج تم اکیلی جا رہی ہو ہوسٹل کی لڑکیاں نہیں آئیں ۔۔"

"جی نہیں ۔۔ آجکل میرا ان کے ساتھ چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ جی چاہتا ہے کہ جہاں جاؤں اکیلی جاؤں ۔۔"

"لیکن مس راخل کب تک یونہی اکیلی چلتی رہو گی ۔۔؟"

"جب تک ہاتھوں اور پاؤں میں جنبش اور رگوں میں زندگی کا خون ہے ۔۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن راخل کیا تم یہ بھی جانتی ہو کہ ایک دن گھر کے نگہبان تھرتھرانے لگیں گے اور زورآور لوگ کبڑے ہو جائیں گے پیسنے والیاں رک جائیں گی کھڑکیوں سے جھانکنے والیاں دھندلا جائیں گی۔ خواہشات مٹ جائیں گی اور پھر ان ہاتھوں اور

اور باؤں میں جنبش اور رگوں میں زندگی کا خون باقی نہ رہے گا ــــ۔"

"ہاں۔ پروفیسر صاحب میں اس سے بھی آگے جانتی ہوں کہ ایک دن خاک سے خاک جا ملے گی جس طرح پہلے ملی ہوئی تھی اور روح خدا کے پاس جس نے اسے دیا تھا واپس چلی جائے گی۔"

راحل نے یہ جملہ ایسے دہرایا جیسے واعظ کی یہ باتیں اسے اچھی طرح یاد ہوں۔

"مس راحل۔ تم یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اکیلے چلنے کی کوشش کرتی ہو۔"

"اس لئے کہ جب میں اپنی مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ نہیں چل سکتی تو اپنے ماں باپ کی مرضی کے مطابق کیسے کسی ایسے شخص کے ساتھ چل سکتی ہوں جو مجھ سے تعلیم اور رتبے میں کہیں پیچھے ہے۔"

"راحل۔ تم جس کو تعلیم اور رتبہ سمجھتی ہو وہ اور ہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ راجیش کے پاس سب کچھ ہے وہ ایک ٹرینڈ ٹکنیک ہے یہ میں جانتا ہوں کہ اس کی تعلیم صرف میٹرک تک ہے۔ لیکن وہ ایک دستکار ہے اور ہمارے ملک کو دستکاروں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔"

"پروفیسر صاحب پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتا۔ عورت کی خوشی کے لئے اور بھی بہت کچھ چاہیئے۔"

"مس راحل! عورت کی خوشی کے لئے رتبہ بھی اتنی اہم چیز نہیں گھر میں آپس کی محبت بہترین شے ہے
جس سے دونوں خوش رہ سکتے ہیں"......

"ہوں"......

اسکے بعد راحل کوئی جواب نہ دے سکی اور وہ خاموش میرے برابر چلتی رہی اس خاموشی میں میرا ذہن کچھ گزرے دنوں کی یادیں دہرانے لگا۔ مجھے وہ دن یاد آیا

جب میں نے پہلی بار راخل کو کالج میں دیکھا تھا۔ چہرے سے سنجیدگی اور معصومیت ٹپکتی تھی اس سے زیادہ مجھے اس کی زندگی میں اور کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید یہ وہی لڑکی ہے جس کی مجھے تلاش ہے جس لڑکی کے چہرے سے سنجیدگی اور معصومیت ٹپکتی ہے جو شرافت کا مجسمہ نظر آتی ہے اس سے بڑھ کر اچھی بیوی کون ہو سکتی ہے۔ میں اس سے تعلقات بڑھانے کی سوچنے لگا کہ اچانک ایک روز راخل ہمارے ڈپارٹمنٹ میں چلی آئی۔ لیبارٹری اسسٹنٹ میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔

“صاحب! راخل صاحبہ گلسرین مانگ رہی ہیں۔”

“ذرا انہیں میرے پاس بلا لاؤ” میں نے کہا۔

راخل سے اس دن زیادہ بات چیت نہ ہو سکی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ یہ خیال میرے ذہن میں شدت سے سما گیا کہ یہ لڑکی واقعی ایک اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہے اسکے بعد وہ مجھ سے کئی بار ملنے آئی ایک دن کہنے لگی کہ میں آپ سے اردو سیکھنا چاہتی ہوں۔ میں خود یہی چاہتا تھا اور پھر کالج ٹائم میں جب بھی میرا پیریڈ خالی ہوتا وہ چلی آتی۔ میں نے اس سے شادی کے بارے میں بات چیت کی تو کہنے لگی “میری شادی کی بات چیت چل رہی ہے میرے ماں باپ چاہتے ہیں کہ کوئی اچھا لڑکا مل جائے تو میری شادی اسی برس ہو جائے۔ آج کل کے پڑھے لکھے عورت سے ملازمت کروانا چاہتے ہیں جو مجھے ہرگز پسند نہیں۔”

“راخل تم نے میرے دل کی بات کہی۔ لیکن میں سوچتا ہوں انسان پر ایک جیسا وقت نہیں رہتا۔ زندگی کے مشکل اوقات میں اگر بیوی بھی کام کرے تو کوئی حرج نہیں ——— تم نے جو کچھ کہا بہت حد تک صحیح ہے میں بھی خدا سے یہی دعا کرتا ہوں کہ مجھے ایسی ہی بیوی ملے۔”

“پروفیسر صاحب! مجھے تو گھر میں اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا بڑا شوق ہے۔

میں بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی اور انگریزی کھانے بنا سکتی ہوں۔"

اسکے بعد وہ کئی روز تک اردو سیکھنے کے بہانے سے آتی رہی۔ اسی دوران میں اس کے کیرکٹر سے متعلق کئی باتیں سننے میں آئیں جن کی چھان بین بھی میں نے رفتہ رفتہ کرلی میں نے سوچا اب جب بھی آئے گی ان ملاقاتوں کا نتیجہ نکل آئے گا یا تو ملاقاتیں ختم ہو جائیں گی یا اور بڑھ جائیں گی۔

کافی روز تک وہ نہیں آئی آخر ایک دن اچانک میرے دفتر چلی آئی میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ ساری کے پلو کو سنبھالتی ہوئی وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"آج میں آپ سے ایک بہت ہی سنجیدہ بات کرنا چاہتی ہوں" میں نے غور سے اسکی طرف دیکھا اس کا سانس پھول رہا تھا دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی تھی ......

میں نے بہت سنجیدگی سے کہا" ہاں ہاں کہو کیا بات ہے۔"

"پروفیسر صاحب! اگر ہم اسی طرح آپس میں ملتے رہے تو ایک دن ضرور بدنام ہو جائیں گے لیکن اگر قانونی طور پر ملیں گے تو پھر بدنامی کا خدشہ نہیں رہے گا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ...... منگنی ہو جائے تو ......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ...... "ہاں تو پھر؟"

"تو پھر اس بدنامی کا ڈر نہ رہے گا ہم اکٹھے گھوم سکیں گے کبھی کبھی اکٹھے پکچر جا سکیں گے اور ......"

"رافل تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر تمہاری بات ختم ہو گئی ہے تو میں بھی تم سے چند سنجیدہ سوال پوچھوں ٹھیک ٹھیک جواب دو گی؟"

"کوشش کروں گی"

"تو سنو۔ تم نے اسی کالج میں تعلیم پائی ہے؟"

"جی ہاں"

"کیا کالج کے دنوں میں کسی لڑکے سے تمہارے تعلقات تھے اگر تھے تو کہاں تک ــــ؟"

"جی۔ جی۔ میرے تعلقات۔۔۔ کسی سے نہیں رہے۔"

وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ اس بوکھلاہٹ کی حالت میں۔ میں نے ایک سوال اور کیا "کیا اس کی وجہ سے تمہاری بدنامی ہوئی کیا اس کے بعد تمہاری منگنی کسی سے نہیں ہوئی اور اب جلد ہی تمہاری شادی ہونے والی ہے۔"

اس کے بعد میں ان سوالوں کا جواب، سننے کے لئے خاموش ہوگیا میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"راحل روؤ نہیں مجھے حقیقت بتاؤ میں تمہاری ہر طرح سے مدد کروں گا۔"

اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "پروفیسر صاحب! میں نے ایک غلطی کی تھی اس غلطی کا احساس مجھے اس وقت ہوا۔ جب میں اچھی طرح آگ کی لپیٹ میں آگئی اس آگ سے بچنے کے لئے میں نے راجیش کا سہارا لیا جس نے یہ سب آگ لگائی تھی میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی میں بی اے ہوں اور وہ صرف ایک میٹرک پاس مکینک۔۔۔۔ اس سے شادی کرنے کے بعد زمانہ مجھے کیا کہے گا یہی کہ ایک بی اے پاس لڑکی نے ایک میٹرک پاس مکینک سے شادی کرلی"

"راحل جہاں زمانہ تمہاری یہ بات دہرائے گا اسکے ساتھ یہ بھی کہے گا کہ ایک بی اے پاس سیجی لڑکی نے میٹرک۔ پاس ٹرینڈ مکینک سے شادی کرکے کتنی زبردست قربانی کی ہے آج سماج بدل رہا ہے تعلیم اور عزت کی قدریں بدل رہی ہیں۔ سیجی سماج کو بھی بدلنا ہے اگر بی اے پاس لڑکی کو ایم اے یا ایم ایس سی لڑکا نہیں ملتا تو ایک مکینک سے شادی کرنے میں کوئی گناہ نہیں بلکہ تمہیں فخر محسوس کرنا چاہیے۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔۔۔۔۔۔ اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

# اس کے بعد وہ نہیں آئی......

آج اس کی باتیں سن کر مجھے کچھ احساس ہوا کہ میری پہلی باتیں اسکے پلّے نہیں پڑیں۔ میں نے سوچا چرچ میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار پھر کچھ پوچھ لوں۔ راخل اگر برا نہ مانو تو میں پھر یہی نصیحت کرونگا کہ سٹیٹس۔ وقار اور تعلیم کو بھول جاؤ راجیش سے شادی کر لو اس جیسا محنتی اور شریف لڑکا تمہیں ہرگز نہ ملے گا۔ اور شادی کے بعد تم سب باتیں بھول جاؤگی اور پھر...... ہمیں بھی........”

“نہیں ایسا تو ہرگز نہیں ہو سکتا......”

نہیں راخل تم ہمیں ضرور بھلا دوگی سچ ہاں شادی میں ضرور بلانا......

میں نے دیکھا راخل کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی...... میرا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ وہ چرچ کے دوسرے دروازے کی طرف مڑی اور مسکرائی جیسے اس نے میری سب باتوں کو قبول کر لیا ہو اور یہ ارادہ کیا ہو کہ اب وہ راجیش کی زندگی میں ایک چاند بن کر سما جائے گی۔

اس کے چند روز بعد راخل کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کی شادی ہو گئی اس نے شادی میں مجھے نہیں بلایا مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں ہوا۔ اسکے جانے کے کچھ ہی دن بعد گھر سے خط آیا کہ تم چھٹی لے کر گھر چلے آؤ۔ بہت ضروری کام ہے گھر جانے پر پتا چلا کہ انہوں نے مجھے منگنی کے لئے بلایا ہے اس کے لئے ہمیں دوسرے شہر جانا پڑا۔ اس سے پہلے کہ منگنی طے پائے لڑکی کے ماں باپ نے یہ چاہا کہ میں اور لڑکی دونوں بیٹھ کر آپس میں بات چیت کر لیں اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو جائیں میں نے سلسلۂ گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا

“آپ نے میٹرک کب کیا۔؟”

"سنہ ۱۹۵۳ء میں"

اس کے بعد آپ نے کہاں تعلیم پائی۔

"بی اے آئی ٹی کالج لکھنؤ سے اور بی ایڈ بھی لکھنؤ ہی سے۔"

"اب آپ کہاں کام کرتی ہیں؟"

"ایم بی ہائر سکنڈری اسکول دہلی میں۔"

"کھانے وغیرہ کا کیا کرتی ہیں؟"

"ایک نوکرانی رکھی ہوئی ہے کیونکہ خود تو مجھے پکانا نہیں آتا۔"

"ہوں! تو کیا آپ شادی کے بعد بھی نوکری جاری رکھیں گی۔"

"جی ہاں۔ میری کوشش تو یہی ہوگی کہ جو تعلیم حاصل کی ہے اس کا فائدہ تو ضرور اٹھانا چاہیے۔"

"لیکن مس شیلا عورت تعلیم کا فائدہ صرف نوکری کرنے سے ہی نہیں اٹھا سکتی گھر میں بچوں کی تربیت اور گھر کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے بھی اپنی لیاقت استعمال کر سکتی ہے خیر خیال اپنا اپنا۔۔۔ اچھا یہ بتایئے آپ کے شوق کیا ہیں؟"

"مجھے تیرنے کا۔ گھوڑے کی سواری اور شکار کا بہت شوق ہے اسکے ساتھ ساتھ پکچر دیکھنے کا کافی شوق ہے۔

"اور مذہب۔۔؟"

"مذہب۔ ہاں تو اس کا بھی تھوڑا تھوڑا سا شوق ہے ویسے تو میرے پاس بہت اچھی بائبل ہے لیکن کام اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کبھی پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور آپکو؟"

"مجھے تو ان میں سے کوئی بھی شوق نہیں کیونکہ تعلیمی زندگی میں قدم قدم پر مصائب کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بعد بمشکل ایم ایس سی کیا آجکل ایک کالج لکچرار ہوں۔ جو کچھ ملتا ہے اس میں سے کچھ ماں باپ کی نذر کر دیتا ہوں جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے

دن رات سخت محنت کر کے مجھے یہاں تک پہونچایا اس کے بعد جو کچھ بچتا ہے یہ اتنا کافی نہیں کہ کلبوں ہوٹلوں میں جا سکوں اور فلم انڈسٹری کو دان کر سکوں میں اپنی زندگی میں ایسا مددگار چاہتا ہوں جو میرے ساتھ مل کر زندگی میں جدوجہد کر سکے جو میرا دامن پیچھے کی طرف کھینچنے کے بجائے مجھے ہر وقت حوصلہ دیتا رہے اور ہم دونوں کی ہر کوشش خدا کو خوش کرنے کے لئے ہو۔ کیا آپ ایسا کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اگر تیار ہیں تو اپنا ہاتھ مجھے دیجئے تاکہ ہم وعدہ کریں کہ ہماری کوششیں قوم اور سماج کی فلاح اور بہبودی کے لئے ... اور ہمارا ہر قدم خدا کی مرضی کے مطابق اٹھے گا۔"

میں نے اشیلا کے خیالات کا جائزہ لینے کے لئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا لیکن مایوس ہو کر وہی ہاتھ چند لمحات کے بعد واپس ہٹا لیا اور اٹھتے ہوئے صرف یہی کہا "میں نے آپ کے ساتھ اس ملاقات سے بہت کچھ سیکھا بہت بہت شکریہ"

گھر واپس آ کر میں نے ماں باپ کی مرضی جانتے ہوئے اپنی طرف سے ایک خط انہیں لکھ دیا۔

اشیلا مجھے افسوس ہے کہ ہم دونوں زندگی میں ایک ساتھ نہ چل سکیں گے۔

تیسرے دن مجھے اس کی طرف سے ایک لفافہ ملا جس میں چند سطور یوں مرقوم تھیں "تمہارے جیسے مذہبی خیالات رکھنے والا اور پرانے زمانے میں رہنے والا ساری عمر ایسا ہی رہے گا تمہیں اور تمہارے خیالات کے مطابق اچھی بیوی نہ مل سکے گی کوشش کر کے پرانے زمانے کو چھوڑ کر نئی اور رنگیلی دنیا میں چلے آؤ تو پھر ....."

---

ریکھا! میری زندگی کبھی سکون سے نہیں گزری شاید میرے ہاتھوں کی وہ لکیر بہت گہری ہے جس کے مطابق موت سے پہلے مجھے غم اور زندگی کی فکر اور تردد سے نجات کہیں مل سکتی ہے میں جذباتی ہوں ریکھا میں اکیلا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

اس خلا کو بھرنے کے لئے مجھے شوبھا کی ضرورت محسوس ہوئی شوبھا کا بی اے کا آخری سال تھا میں نے اس کے لئے اپنے ماں باپ سے بات کی وہ رضامند ہو گئے۔ شوبھا کے ماں باپ سے اسکی بھیک مانگنے کے لئے میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ مل کر اپنا دامن پھیلا دیا! لیکن ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ خالی دامن سمیٹ لیا اس کے ماں باپ کی ایک ہی رٹ تھی کہ ابھی یہ ایم اے کریگی پھر امریکہ جائے گی۔ وہاں سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے گی پھر کہیں ۲۵ برس کی عمر میں شادی کرے گی۔

ریکھا۔ شوبھا نہ ایم اے کر سکی اور نہ امریکہ جا سکی۔ لیکن اس نے خودکشی کر لی اسکے کمرے سے ایک خط ملا جس میں یہ مرقوم تھا وہ اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتی اس لئے وہ اس جہان سے جا رہی ہے۔

آج تک اس کی خودکشی کی وجہ کا پتا نہ چل سکا لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے باپ نے اسے ایک دولت مند عیاش کے ہاتھ بیچنا چاہا تھا اس لئے اس نے یہ قدم اٹھایا اور پھر ریکھا زندگی کے چوتھے موڑ پر میں تم سے ٹکرا گیا نہ جانے یہ قدرت کا کیا اصول ہے کہ بہاریں اکثر گلستانوں ہی میں آتی ہیں ویرانے چاہے انکے کتنے ہی حقدار کیوں نہ ہوں۔

لیکن میں خوش نصیب ہوں ریکھا کہ تم نے مجھے سہارا دیا اور میری زندگی کے تاریک کونوں میں تم نے ہزاروں چراغ روشن کر دیے ریکھا تم اب میری ہو میری زندگی کی تاریک راہوں کا اجالا۔"

"سچ میرے سرتاج"

میں کچھ بھی نہ کہہ سکا دوسرے ہی لمحہ ریکھا میری چھاتی سے لگ گئی جیسے کہہ رہی ہو ساجن تم بھی میرے چاند ہو میری زندگی کے اجالے میری راہوں کے اجالے ــــ!

# دردِ نہاں

ممی پاپا کب آئیں گے کرسمس تو نزدیک آتا جا رہا ہے......؟

یہ سوال اختر نے اس وقت اپنی ماں سے پوچھا تھا جب وہ ابھی تین ہی سال کا بچہ تھا۔

"میرے لال وہ جلد لوٹ آئیں گے انہوں نے کہا تھا کہ کرسمس تک تو واپس آ ہی جائیں گے۔"

یہ آج سے دس سال پہلے کی بات تھی جب اختر ابھی تین ہی سال کا بچہ تھا اور وہ ماں کی ہر بات پر یقین کر لیتا تھا۔ اختر کا باپ گوا کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہا تھا اب اختر پورے تیرہ سال کا ہو چکا تھا۔

"ممی میں سونے لگا ہوں گڈ نائٹ"

جمیلہ نے باورچی خانہ سے ہی بیٹے کو جواب دیا "اچھے بیٹے گڈ نائٹ"

جمیلہ باورچی خانہ میں کرسمس کے لئے تھوڑی بہت مٹھائی تیار کر رہی تھی اسے معلوم تھا کل کرسمس ہے اس کا ننھا منا بیٹا مٹھائی مانگے گا دوسرے بچوں کی طرف دیکھ کر اسکا جی للچائے گا تھوڑی سی رقم جو اس نے بچائی تھی اس سے اس نے ایک جوڑا کپڑوں کا اپنے لئے اور ایک جوڑا اختر کے لئے سلوایا تھا اور باقی پیسوں کا کرسمس کے لئے سودا خرید لائی تھی اس نے جلدی جلدی باورچی خانہ کا کام ختم کیا اور حسب معمول اپنے لال کو پیار

کرنے چلی آئی۔ اختر گہری نیند سو رہا تھا اس کے سرہانے لیمپ جل رہا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ پریوں کے دیش میں پہونچ گیا ہو اس کے چہرے سے ابھی بچپن اور معصومیت کے آثار ٹپک رہے تھے جمیلہ اندر آکر اس کے پلنگ کے پاس کھڑی ہوگئی کافی دیر تک اسکے چوڑے ماتھے لمبی لمبی پلکوں اور بھرے بھرے گالوں کو دیکھتی رہی اس کا خوبصورت چہرہ بھی اپنے باپ پال جیسا ہی تھا ابھی سے وہ پیاری پیاری عادتیں اسکے اندر پیدا ہورہی تھیں اٹھنے بیٹھنے چلنے بولنے کا انداز وہی ہوتا جارہا تھا اب بھی اپنے باپ کی طرح ایک ہتھیلی اپنے گال کے نیچے رکھے سو رہا تھا۔ پال کا خیال آتے ہی جمیلہ کے دماغ سے پرانی یادیں ایک فلم کی طرح گزرنے لگیں آنکھوں میں چند آنسو امڈ آئے اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی جس میں پال کی بڑی سی تصویر تھی اس نے اس تصویر کو بڑی احتیاط سے اتارا اور پھر ایک بڑے ٹرنک سے صندل کی لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا جو کسی وقت پال اپنی جمیلہ کے لئے لایا تھا۔ اس نے اس ڈبہ میں سے ایک مڑا ہوا میلا سا نیلا کاغذ نکالا جس پر بہت برس پہلے کی تحریر تھی جمیلہ یہ تحریر اور تصویر لے کر پھر اسی کمرہ میں لوٹ آئی اور چھوٹی سی کرسی کھینچ کر اختر کے پاس بیٹھ گئی تصویر کو ذرا روشنی میں کرکے دیکھا پھر اختر کے بھرے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی جس پر ابھی تک مسکراہٹ کے پھول بکھرے ہوئے تھے چند لمحات دیکھنے پر اس کا جی اور بھر آیا۔ تصویر کو سینے سے لگا لیا لیکن تصویر بول نہیں سکتی دل بہلا نہیں سکتی یہ خیال آتے ہی تصویر کو ایک طرف رکھ دیا اور شدت احساس سے مجبور ہوکر سوتے ہوئے بچے کی پیشانی چوم لی۔ ساتھ ہی چند گرم آنسو جمیلہ کی آنکھوں سے بہہ کر بچے کی پیشانی پر بکھر گئے۔ جمیلہ نے جلدی ہی وہ قطرے اپنے ریشمی آنچل میں سمو لئے اور پھر وہی پرانی تحریر خود بخود ہاتھوں میں آگئی نہ جانے کتنی بار وہ اس تحریر کو پڑھ چکی ہوگی اور کتنے آنسو اس پر گرے ہونگے لیکن آج پھر وہ تحریر کو شروع سے پڑھنے لگی۔

"میری اچھی جمیلہ اور بہت ہی پیارے بیٹے اختر.......

بہت دنوں سے میں تمہیں خط نہیں لکھ سکا ادھر گوا میں کافی جلوس نکالے جا رہے ہیں اور ان جلوسوں کی قیادت مجھے ہی کرنی پڑتی ہے نہ جانے کون سی ایسی چیز میرے اندر دیکھتے ہیں سب سے آگے پوسٹر لے کر میں ہی چلتا ہوں کئی دن سے جیل میں تھا ابھی کل ہی رہا کیا گیا ہے جمیلہ گھبرانا نہیں خدا سے میرے لئے دعا کرنا اپنے وطن کا تحفظ بھی میرا فرض ہے میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔ ہاں جمیلہ سردی کا موسم آ رہا ہے اختر کا خیال رکھنا اس کی دیکھ بھال کی طرف دھیان دینا اسے کسی چیز کی کمی نہ رہے امید ہے کرسمس تک واپس آ جاؤں گا تمہیں کبھی کبھی ورشو کے ہاں چلی جایا کرو۔ دل بہل جایا کریگا پھر ہفتہ میں ایک دو بار پادری صاحب کے ہاں ہو آیا کرو پیسوں کی ضرورت ہو تو مسٹر جیکب سے لے لینا وہ انکار نہیں کریں گے میں آ کر سب چکا دوں گا۔ ہاں میں نے اپنا پتا نہیں لکھا۔ ہمارا اپنا ٹھکانہ کوئی نہیں کبھی جیل میں کبھی جیل سے باہر۔ سو تمہیں خط لکھنے کی ضرورت نہیں اگر لکھو تو مجھے مل نہیں سکے گا کیونکہ پہلے کی طرح اب ٹھکانا نہیں رہا۔ بیٹے کو بہت بہت پیار اور تمہیں بھی جمیلہ۔

تمہارا پال

یہ پال کی طرف سے آخری خط تھا اس نے اس کاغذ کو چوم کر ایک بار پھر سینے سے لگا لیا لیکن ایک بوسیدہ کاغذ کا ٹکڑا دل نہیں بہلا سکتا اور پھر جمیلہ نے اس وقت بھی جب پال کا ٹھکانا تھا اسے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے اس کے دل کو چوٹ پہنچتی وہ یہ سوچ کر اپنے دل پر پتھر رکھ لیتی کہ میں ہی ایسی نہیں جس کا شوہر گوا گیا ہے نہ جانے کتنی عورتیں مجھ جیسی ہوں گی جن کے شوہر دیش کے لئے شہید ہو چکے ہیں یہ خط پڑھتے ہی بیتی یادیں پھر دماغ میں آ دھمکیں۔ بیتی زندگی کی خوشیاں یاد آنے لگیں اور وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ باہر چاندنی رات میں نہائی ہوئی عمارتیں خاموش کھڑی تھیں وہ سوچنے لگی "اب جینے کا کیا فائدہ ......" وہ کھڑکی بند کر کے لوٹ کر پھر اسی

کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ خیالات کی شاہراہ پر چلتی ہوئی ایک حسین وادی میں پہونچ گئی اور آج سے پندرہ برس پہلے کے واقعات ایک ایک کرکے اسکے حساس ذہن سے گزرنے لگے۔ وہ سوچنے لگی پال اپنے باپ اور چھوٹی بہن کے ساتھ ڈلہوزی جا رہا تھا اسی روز میں اور میری چھوٹی بہن پاپا جی کے ساتھ ڈلہوزی دیکھنے جا رہے تھے پٹھان کوٹ میں میں نے انہیں بس اسٹینڈ پر ٹہلتے دیکھا موٹی موٹی آنکھیں چوڑا ماتھا گورا خوبصورت چہرہ خوب بھرا بھرا جسم۔ میں کچھ فطرتی طور پر ان کی طرف کھنچ گئی اور ان کی طرف دیکھنے لگی۔ انہوں نے بھی ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اچانک کنڈکٹر نے بس چلنے کے لئے وسل دی۔ وہ بھاگ کر بس میں آ کر عین میری پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور انکے پتا جی اور چھوٹی بہن بھی۔ میرا دل نہ جانے کیوں دھک دھک کرنے لگا۔ بس چل دی اور چکی کا مقام گزرنے کے بعد سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک پر دوڑنے لگی۔

لوگ باتوں میں مصروف تھے پتا جی میرے ساتھ ڈلہوزی سے اوپر پیدل جانے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن میں یوں ہی " ہوں۔ ہاں " کر رہی تھی۔ میرے کان اور دھیان پال کی میٹھی میٹھی باتوں کی طرف تھے جو وہ اپنے باپ اور چھوٹی بہن سے کر رہے تھے باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کتنے بہادر دریا دل اور خوش طبیعت ہوں گے ہر بات روحانیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب کبھی بس اچھلنے یا ٹھہرنے پر دھکا لگتا تو ان کی گرم گرم سانسیں مجھے اپنی گردن پر محسوس ہوتی تھیں اور میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی تھی کئی بار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کوشش کرنے پر بھی جی بھر کر دیکھنے کی جرارت نہ ہوئی۔

ڈلہوزی پہونچ کر ہم جدا ہو گئے انہوں نے میری طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں

مایوس ہوگئی۔ دوسرے دن ہم نے کھجیار جانے کا پروگرام بنایا اور ہم صبح سویرے چل دیے لکڑمنڈی گزرنے کے بعد وہ تینوں بیٹھے ہوئے نظر آگئے میری خوشی کی انتہا نہ رہی میں نے پتا جی سے کہا "پتا جی میں تھک گئی ہوں ہم بھی ذرا آرام کرلیں" "اچھا بیٹا ہم بھی یہیں بیٹھ جاتے ہیں" سو ہم بھی وہاں بیٹھ گئے پتا جی ان سے باتیں کرنے لگے پتا چلا کہ وہ بھی مسیحی ہیں اور کھجیار دیکھنے جا رہے ہیں پھر ہم اکٹھے روانہ ہو گئے راستہ میں ایک دوبار میں نے ان سے بات چیت کرنے کی جرارت کی لیکن ہچکچاہٹ میں کہہ نہ سکی بڑی شکل سے ایک بات پوچھی

"کیوں جی کھجیار ابھی کتنی دور ہے" ——؟

"ہوگا کوئی سات آٹھ میل"

میں گھبرا گئی تھی کہ سات آٹھ میل تو بہت دور ہے ہم چار پانچ میل چل بھی آئے ہیں لیکن مجھے پریشان دیکھ کر وہ خود ہی بولے۔

"گھبرا تو نہیں گئی صرف ڈیڑھ میل اور ہے۔"

اور پھر ہم کھجیار پہونچ گئے شام ہو چکی تھی اگلے روز سورج نکلنے پر ہم چھوٹی سی جھیل کے کنارے آ گئے جھیل میں اندر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ چھوٹی سی کشتی لگی ہوئی تھی جس میں مشکل سے چار آدمی بیٹھ سکتے ہوں گے وہ کشتی میں بیٹھ گئے تھے انہوں نے پتا جی سے کہا "آؤ چاچا جی آپ کو کشتی میں بٹھا کر جھیل کی سیر کرائیں۔"

نہ جانے میرے دل پر اسوقت کیا گزری کہ مجھے پوچھا ہی نہیں لیکن میرے پتا جی نے کہا "بیٹا میں تو بیٹھوں گا نہیں۔ جمیلہ اور شنیلہ کو بٹھا لو" اور میں کتنی خوش ہو گئی تھی پھر میں اپنی چھوٹی بہن کو لے کر کشتی میں سوار ہو گئی تھی ان کے اور میرے پتا جی ان کی چھوٹی بہن کو ساتھ لئے ہوئے سیڑھیوں پر کھڑے باتوں میں مصروف تھے اور وہ کشتی کو دھیرے دھیرے کھیتے ہوئے گہرے پانی میں لے گئے اور میں حسین خوابوں کی دنیا میں کھو گئی تھی۔ مستقبل کے

دھندلے خاکے میری آنکھوں کے سامنے تانا بانا بننے لگے تھے۔ میری چھوٹی بہن خاموش بیٹھی تھی میں سوچ رہی تھی کہ کاش اب کنارہ نہ ملے اور ہم کشتی میں اسی طرح بیٹھے رہیں وہ اس کشتی کے ملاح ہوں اور میں انکے بہت نزدیک بیٹھی رہوں اور یہ کشتی اسی طرح ہلکی پھلکی لہروں پر بہتی رہے۔ جب ہماری کشتی جھیل کے عین بیچ میں پہونچی تو وہ ناگہاں بول اٹھے۔

"جمیلہ"

"ہوں ــــ"

"یہ منظر کیسا ہے ــــ؟"

"میں گھبرا سی گئی اور بڑی مشکل سے اتنا ہی کہہ پائی "بہت اچھا ہے جی"

"یہ فردوس کا چھوٹا سا ٹکڑا اور اس میں یہ چھوٹی سی جھیل تمہیں پسند ہے نا ــــ؟"

"جی ــــ ہاں"

"اور اس جھیل میں بہتی ہوئی کشتی اور اس کا ملاح بھی ــــ"

میں شرما گئی کچھ کہہ نہ سکی انہوں نے اپنی بات کا جواب پانے کے لئے میری طرف دیکھا لیکن میں خاموش تھی وہ دھیرے دھیرے کشتی ساحل پر لے آئے اور وہ سپنا ٹوٹ گیا۔

اور پھر ڈلہوزی سے واپسی کے ایک سال بعد ہماری شادی ہوگئی جب وہ تھے نہ کوئی دکھ نہ کوئی غم اور نہ ہی کسی بات کی فکر صرف زندگی تھی اور ان کا سہارا تھا جیسے بہاریں زندگی میں اپنا گھر کر گئی تھیں۔

پال جمیلہ کو "میری زندگی" کہا کرتا تھا لیکن اب جمیلہ کو محسوس ہوا کہ پال ہی اسکی زندگی تھی جو اس سے دیش کی خاطر چھین گئی۔ وہ زور زور سے رونا چاہتی تھی لیکن رو کر سنائے کسے؟ جب وہ گھر میں ہوتے تو جمیلہ ان کو خوش کرنے میں کوئی کسر

اٹھا نہ رکھتی کبھی ادھر کبھی ادھر وہ کام سے جھنجلاتی نہ تھی ہر وقت سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ گھر ہر وقت صاف اور سلیقے سے سجا رہتا۔ پال کبھی کبھی کہتا۔

"میری زندگی۔ تم ہر وقت، کام کرتی رہتی ہو۔ کبھی آرام کر لیا کرو۔"

لیکن جمیلہ مسکرا کر کہہ دیتی۔ "میرے سرتاج کام کرنے سے تو مجھے خوشی ہوتی ہے اگر میں گھر کا کام نہ کروں تو ہمیں نوکر رکھنا پڑے گا جو میں نہیں چاہتی۔"

شروع شروع میں پال کا ایک خط آیا تھا اس کے بعد ڈیڑھ ماہ تک کوئی خط نہیں آیا ادھر کرسمس نزدیک آتا جا رہا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کرسمس تک لوٹ آؤنگا لیکن ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ آخر ایک دن ڈاکیہ ایک لفافہ لایا جمیلہ نے لپک کر لفافہ لے لیا اور اسے کھولا۔ دیکھا تو اسکے ہوش اڑ گئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان ابل پڑا زبان سے چیخ دپکار شروع ہو گئی لکھا تھا کہ "جناب پال صاحب جلوس نکالتے وقت سب سے آگے تھے جلوس پر پرتگالیوں نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی لوگ پیچھے کی طرف بھاگے لیکن پال صاحب اور چند نوجوان دیش کی خاطر شہید ہو گئے دیش میں انکا نام امر رہے گا۔" پھر کچھ تسلی کی باتیں لکھی تھیں یہ خط ان کے کسی دوست نے لکھا تھا جو کہ مسیحی تھا جس دن پال کا خط آیا ننھی سی جان بخار میں بھن رہی تھی پال کی شہادت کی خبر سنتے ہی آس پڑوس کے مسیحی اکٹھے ہو گئے۔

کچھ مسیحی بہنیں میری دیکھ بھال میں لگ گئیں اور کچھ اس ننھی سی جان کی دیکھ بھال میں۔ دو دن تک میں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور بہت کمزور ہو گئی تھی ...... پھر چند روز بعد اختر کا بخار ٹوٹ گیا اور ایک دن وہ کہنے لگا۔

"ممی جس دن میں بیمار تھا تم رو کیوں رہی تھیں۔ ممی دیکھو میں بھی بہت رو رہا تھا اور تم نے مجھے چپ نہیں کرایا۔ ممی ایسے نہ رویا کرو۔ نہیں تو جب پاپا آئیں گے میں ان کو بتا دوں گا۔"

یہ سنتے ہی میرا دل بھر آیا تھا اور آنسو پونچھتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکی تھی " اچھا میرے بیٹے ۔"

اور پھر کرسمس کے لئے میرے پاس کپڑے نہیں تھے اختر کے پاس جوتی نہیں تھی لیکن جب کرسمس آیا تو خدا نے سب امیدیں پوری کر دیں۔ کرسمس سے ایک دن پہلے ایک پارسل ملا جس میں اختر کے لئے کپڑے اور جوتی اور اسی طرح میرے لئے بھی بہت کچھ بھیجا گیا تھا اور پارسل بھیجنے والا پال کا کوئی مسیحی دوست ہی تھا۔ جس سے انکی واقفیت گوایں ہی ہوئی تھی آج بھی اسی طرح ان کے کسی مسیحی دوست نے پارسل بھیج دیا اور ـــــ

یہ سب کچھ سوچتے سوچتے نہ جانے کب جمیلہ کو نیند آ گئی اور وہ اختر کے پلنگ کا سہارا لے کر چھوٹی سی کرسی پہ بیٹھی بیٹھی سو گئی جب صبح ہوئی تو کرسمس کی خوشی میں اختر جلدی جلدی اٹھ بیٹھا اور جمیلہ کو وہیں سوتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"ممی ـــ ممی بڑا دن مبارک ہو۔"

جمیلہ ایک دم چونک کر اٹھی اور آنکھیں ملتے ہوئے اس نے اختر کی طرف دیکھا جو اپنی بات کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ جمیلہ نے بھی کہا "میرے لال تمہیں بھی مبارک ہو۔" اور پھر اس نے اختر کو سینے سے لگا کر پیار کیا۔ "ممی لاؤ میرے کپڑے جو پاپا نے کل بھیجے ہیں اور ہاں ممی تم نے بتایا ہی نہیں کہ پاپا کب آئینگے ـــ؟"

میرے بیٹے وہ ـــ " انہوں نے ابھی کوئی تاریخ تو نہیں لکھی لیکن وہ جلد آجائیں گے ـــ" جمیلہ نے دل کا درد اور چوٹ چھپاتے ہوئے بڑی مشکل سے یہ بات کہی۔

"اور دیکھو ممی میرا دل نہیں لگتا کبھی کبھی پاپا کے بغیر۔"

لیکن جمیلہ بے چاری اور کیا کہتی! سچ بولتی تو ننھی سی جان پہ نہ جانے

کیا گزرتی لیکن وہ جلد ہی بات کو ٹال گئی "دیکھو بیٹا رات میں نے تمہارے لئے خوب مٹھائی تیار کی ہے آؤ تمہیں دکھاؤں اور ہاں آج دس بجے گرجے بھی جانا ہے نا۔ تو آؤ پہلے تمہیں گرم پانی سے نہلاؤں پھر کھانا کھا کر خوبصورت کپڑے پہن کر ہم خداوند کا جنم دن منانے جائیں گے" اور جمیلہ اختر کو پچکارتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

# کالی اوڑھنی

آسمان صاف تھا.......

اچھا بھئی پرویز بس یہ آخری بازی کھیل کر چل دوں گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــ؟

تمہاری بھابی گھر پر میری راہ دیکھ رہی ہوں گی۔

اتنا ڈرتے ہو بھابی سے۔

اس بچاری سے کیا ڈرنا۔ اس نے تو آج تک کچھ کہا ہی نہیں۔ یہ مبارک نعمت تو تمہاری بیگم ہی کو نصیب ہے۔

ہاں بھئی ہماری بیگم کے لئے جو کچھ کہو بالکل درست ہے اس نے تو میرا گھر میں رہنا دو بھر کر رکھا ہے۔ اب یہاں سے جلدی جاؤں گا تو کہے گی۔ دوکان سے اتنی جلدی کیوں چلے آئے۔ اگر دیر میں کبھی جاؤں، تو فرمائے گی کسی کے ہاں رہ گئے تھے اتنا بھی خیال نہ تھا کہ گھر پر کوئی نصیبوں جلی تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ اور بس پھر کھانا دانا تو گیا چولہے بھاڑ میں آدھی آدھی رات تک ہم پر خوب جم کر دھاوا بولا جاتا ہے۔

چلو چھوڑو ان باتوں کو، گھروں میں اکثر ایسا ہوا ہی کرتا ہے

اختر مجھے تو تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے خدا اگر کسی کو ساتھی دے تو

بھابی جیسا دے۔ لو ابھی کل ہی کا تازہ قصہ ہے کرسمس کے لئے گھر میں ابا جان اور میں کچھ حساب کتاب لگا رہے تھے میں نے کہیں کہہ دیا کہ اگر ابا جان اس دفعہ کچھ گرم کپڑے بازار سے خرید کر اپنے اردگرد کے غریبوں میں بانٹ دیں تو بہت ہی اچھا رہے گا۔ ابا جان نے میری پیٹھ ٹھونکی کہنے لگے شاباش پرویز آج تو نے میری طبیعت خوش کر دی۔ ہمیں جب خدا نے اتنی دولت دی ہے تو ہمیں چاہیے کہ اپنے غریب بھائیوں کا خیال رکھیں۔ ابا جان نے اپنے حساب خاص سے آٹھ سو روپے اس کام کے لئے دے دیئے ادھر میں رقم لے کر اپنے کمرہ میں پہونچا ادھر سے بیگم صاحبہ آنازل ہوئیں "یہ غریبوں کو کپڑے سلوا کر دیئے جا رہے ہیں اور ہم گھر والے ننگے پھریں؟"

تمہارے یہ جو اتنے کپڑے رکھے ہیں ان کو کہاں رکھو گی۔

کون سے کپڑے ہیں جن کا تم طعنہ دے رہے ہو کون سی تم نے مخملیں لا لا کر مجھے پہنائی ہیں۔

وہ کپڑے نہیں تو کیا ہیں؟ کیوں جھوٹ بولتی ہو تمہارے پاس اتنے کپڑے ہیں کہ اگر ہر روز چار چار جوڑے بھی بدلو تو چھ مہینے میں ختم نہ ہوں۔

بس پھر کیا تھا لگ گئی آگ مجھ سے بھی نہ رہا گیا میں نے بھی کھری کھری سنا دیں دراصل نگہت کو اپنے والدین کی دولت کا گھمنڈ ہے۔

چلو، چھوڑو پرویز مجھے دیر ہو رہی ہے

اچھا بھئی کب ملاقات ہوگی

تم کل گھر پر ہی آجانا........

اچھا ——

اختر پرویز سے چھٹکارا پا کر سیدھا گھر پہونچا آہستہ سے دروازہ کھولا اور پھر

اندر جاکر آہستہ سے بند کر دیا۔ بتی دھیمی دھیمی جل رہی تھی رضیہ بستر پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اختر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا رسوئی میں گیا اور چپ چاپ برتنوں میں کھانا نکالنے لگا مگر پیشتر اس کے کہ وہ روٹی کو ہاتھ لگاتا کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "ایسے چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں آنا کس سے سیکھا ہے؟"......

ارے تم سوئی نہیں۔

لائیے میں کھانا نکال دوں۔

جاؤ تم آرام کرو میں خود ہی نکال لوں گا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟...... آپ دن بھر دفتر میں کام کرتے کرتے تھک جاتے ہوں گے اسوقت آپ کو آرام کرنے کی ضرورت ہے چلیے اٹھیے وہاں چارپائی پر بیٹھیے گا میں سب کچھ وہیں لاتی ہوں.......

مجھے تو یہیں بیٹھ کر کھا لینے دو

اٹھیے نا، رضیہ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا ہی دیا۔

آج اتنی جلدی کیسے آگئے؟......

یوں کہو اتنی دیر سے کیسے آئے......؟

مطلب تو یہی ہے میرا ـــــ

ذرا پرویز کے ہاں ٹھہر گیا تھا۔

وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔

تمہیں بہت دیر انتظار کرنا پڑا۔

نہیں تو مگر ـــــ

مگر کیا؟ ـــــ اختر نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میرا مطلب ہے دفتر سے آکر خالی پیٹ وہاں بیٹھے رہنا ذرا اچھا نہیں ہوتا

اگر گھر آ کر کچھ کھا پی کر چلے جایا کریں تو اچھا ہے۔

اچھا جی کل سے ایسا ہی ہو گا۔

اچھا بھئی رضو! اس دفعہ بڑے دن پر کیا کیا لایا جائے؟

جو آپ کی مرضی ہو ——

اور تمہاری مرضی ورضی کچھ نہیں ہے۔

کیا ہے؟ جو آپ کی پسند وہی میری پسند ہے......

پھر بھی تمہارے لئے کیا لایا جائے؟

دیکھئے اس دفعہ آپ اپنے لئے ایک سوٹ سلوا لیجیے گا......

ایسا نہیں ہو سکتا۔ تمہارے لئے کچھ نہ کچھ تو ضرور سلنا چاہیے۔

اگر میرا کہا مانیں تو مجھے ایک کالی سلکی اوڑھنی لا دیجیے گا اور اپنے لئے سوٹ بس یہ آخری فیصلہ ہے اب اگر آپ نے کوئی اور ضد کی تو میں رو دوں گی۔

ہٹ پگلی کہیں کی —— لو یہ برتن اٹھا لو......

بس کھا چکے اور آج کیا ذرا پرویز کے پاس کھا پی لیا تھا؟ میں نے نگہت بہن سے سنا ہے وہ گھر ہی نہیں جاتے اور نہ گھر پر کھانا کھاتے ہیں.... بچارے کی زندگی دوبھر ہو گئی۔

گھر کیا جائے جاتے ہی نگہت بہن اس سے لڑنا شروع کر دیتی ہے بچارہ کئی کئی دن دوکان پر ہی گزارتا ہے

قصور بھائی پرویز کا بھی ہے۔

ہاں ہے تو دونوں ہی کا، دراصل دونوں نے گرم طبیعت پائی ہے ہاں اسی لئے تو دن رات.......

پرویز بھائی کے ابا جان تو بہت شریف آدمی ہیں۔

ان کی کیا بات کرتی ہو، فرشتہ ہیں فرشتہ...... مگر بھئی وہ کسی پر سختی کرتے نہیں نگہت چوبیس گھنٹے اپنے میکے والوں کا طعنہ دیتی رہتی ہے۔ نگہت کے ماں باپ کچھ امیر ہیں؟...... برابر ہی کی ٹکر ہے۔

---

گھٹا چھائی ہوئی تھی اور شام کو اختر دفتر سے جلدی چلا آیا وہ بازار سے کالا ریشمی دوپٹہ اور کچھ پھل وغیرہ خرید کر گھر کی طرف آ رہا تھا مال روڈ پار کرتے وقت اچانک ایک موٹر کی آواز سن کر پیچھے جو ہٹا تو ہاتھ سے ایک بنڈل گر گیا ـــ گھبراہٹ میں جلدی سے بنڈل اٹھانے ہی لگا تھا کہ ایک کار زن سے آئی اور غریب اختر کو کچلتی ہوئی گزر گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیڑ لگ گئی لوگوں نے جلدی جلدی ہسپتال پہونچایا۔ مگر انہونی کو کون روک سکتا ہے رضیہ کی امیدوں کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ غریب اختر رضیہ رضیہ پکارتا چل بسا۔

پرویز کو دوکان ہی پر کسی ملنے والے نے یہ واقعہ بتایا تو وہ بھاگا بھاگا ہسپتال پہونچا۔ مگر وہاں اسے زندہ اختر کے بجائے مردہ اختر ملا۔

---

رضیہ پلنگ پر اوندھی لیٹی کچھ گنگنا رہی تھی دروازہ پر آہٹ ہوتے ہی جھپٹ کر دروازہ پہ پہونچی اسے معلوم تھا اختر ہر پہلی تاریخ کو کچھ نہ کچھ ضرور لاتا ہے اور اس دفعہ تو دسمبر کی پہلی تھی مگر رضیہ کے دل پر بجلی گر پڑی جب اس نے پرویز بھائی کی بھیگی ہوئی آنکھوں اور اس کے پیچھے کچھ آدمیوں کو ایک چارپائی اٹھائے کھڑے دیکھا۔ "یہ کون ہے پرویز بھائی؟" پرویز بالکل خاموش کھڑا تھا۔ "بولتے کیوں نہیں" آخر کیا بات ہے خدارا بتاؤ نا وہ کہاں ہیں۔ کہیں انہیں تو کچھ نہیں ہو گیا؟....

بھابی..... اختر..... بھائی......

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اسکے گلے میں جیسے کسی نے سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہو وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ رضیہ دیوانہ وار چارپائی کی طرف لپکی۔ دھاڑیں مار مار کر وہیں چارپائی پر بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ تھوڑی دیر کے بعد پرویز کے والد اور اسکی بہن یاسمین بھی وہاں آ پہنچے۔ رضیہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی وہ کبھی اپنے بال نوچتی کبھی سر کو دیوار سے ٹکراتی مگر افسوس جانے والا جا چکا تھا پھر جب اختر کا جنازہ اٹھایا گیا تو رضیہ کی آہ وزاری سے لوگوں پہ رقت کا عالم طاری ہو گیا سب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

پل کے پل میں رضیہ کی ہنستی کھیلتی دنیا بدل گئی جس گلشن میں کل تک بہار رقصاں تھی اب وہاں خزاں کے منحوس قدم پہنچ چکے تھے بعض اوقات رضیہ کو محسوس ہوتا کہ وہ سامنے کھڑے کہہ رہے ہیں "رضو جلدی چائے تیار کرو بھئی دیر ہو رہی ہے" پہلی بار جب ایسا ہوا تو وہ چپ چاپ اٹھ کر باورچی خانہ میں جا پہنچی اور خالی دیگچی چولھے پہ رکھ دی جب جلتی ہوئی دیا سلائی کی گرمی نے اسکی انگلی کو ہلکی سی آنچ دی تو اسکے حواس نے پلٹا کھایا وہ دھندلا سا نقش جو ابھی ابھی اسکے شعور میں ابھرا تھا نہ جانے کون سے اندھیرے میں گم ہو گیا وہ۔ بے اختیار ہو گئی دھم سے چارپائی پر آ گری وہ روتی رہتی۔ اور کبھی آنکھیں اٹھا کر سامنے دیوار پہ لٹکے ہوئے کپڑوں کو دیکھتی کبھی بے اختیار ہو کر اختر کی قمیصوں کو اپنے سینہ سے لگا لیتی۔ ان کپڑوں کو چومنے میں اسے اپنا درد کم ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا ان کپڑوں میں ابھی تک انکی محبت کی خوشبو بسی ہوئی تھی وہ کبھی چارپائی سے اٹھ کر ادھر جاتی کبھی غسل خانے سے برآمدے تک آتی کبھی اختر کے جوتوں کو صاف کرتی کبھی ان کے تکیہ کو پکڑ کر پوچھتی تم کیوں خاموش ہو تم کیوں نہیں بولتے تم نے اکثر ہماری محبت کی باتیں سنی ہیں تم نے بارہا ہماری محبت کے گیتوں کو اپنے آپ میں جذب کیا ہے۔۔۔ کہاں ہیں

...... کہاں ہیں وہ ........ بولو ......... بولو ....... بولتے کیوں نہیں وہ چلے گئے ...... نہیں کبھی نہیں ......... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جا سکتے ...... اختر ..... پیارے اختر ایک بار ہی آ جاؤ ........ ایک دفعہ وہ پھر باورچی خانے سے باہر کے دروازہ تک گئی۔ اس کی نظر ایک کالی ریشمی اوڑھنی پر پڑی جس پر ابھی تک خون کے سرخی مائل دھبے پڑے ہوئے تھے اس نے فرطِ غم میں چادر کو اٹھا لیا اور وہیں زمین پر لیٹ گئی اس نے چاہا کہ اوڑھنی کو پھاڑ ڈالے مگر وہ ایسا نہ کر سکی اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کہہ رہا ہو "میری آخری نشانی کی یہ بے حرمتی ...... رضیہ چیخ اٹھی ...... تو ...... تو! میری موت میری دشمن تو نے انہیں مجھ سے چھین لیا ...... اور پھر اسکے بعد وہ ان خون کے دھبوں کو چومنے لگی ...... اور نہ جانے کب تک وہ ان خون کے دھبوں کو چومتی رہی ...... مگر ان آنسو دیکھنے والا تو تاریکیوں میں گم ہو چکا تھا۔

پرویز اپنے ابا جان، نگہت اور یاسمین کے کہنے پر رضیہ کے گھر لینے چلا گیا مگر پرویز کا دل بار بار کہہ رہا تھا رضیہ اس گھر کو نہیں چھوڑے گی مگر پھر خیال آتا کہ اگر وہ نہ آئی تو اسکی گزر کیسے ہو گی ــــ بیوہ نے بچی کا بیاہ کیا تو تین ماہ بعد خود ہی چل بسی۔ باپ بیچارہ پہلے ہی خدا کو پیارا ہو چکا تھا لے دے کے اگر سہارا تھا تو بچارے اختر کا ــــ سو وہ بھی رخصت ہوا۔

---

جیسے ہی وہ گھر کے اندر داخل ہوا اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے زبردستی اس کو قبر کی تاریکیوں میں ڈھکیل دیا ہو اندر ایک عجیب سکوت چھایا ہوا تھا رضیہ چارپائی پر اوندھی لیٹی سسکیاں بھر رہی تھی "بھابی ــــ بھابی" پرویز نے آہستہ سے پکارا ...... ایک آہ اور دو سرخ سوجی ہوئی آنکھیں ...... پرویز رضیہ کی ایسی حالت دیکھ کر

ہت ہی پریشان ہوا۔ وہ اپنے دماغ پر زور دینے لگا کہ کس طرح بات شروع کروں... آخر ہچکچاتے ہوئے اس نے صاف صاف کہہ دیا "بھابی میں تمہیں لینے آیا ہوں"....

کیوں؟

ابا جان کا خیال ہے تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی۔ ابا جان کا بہت بہت شکریہ

کچھ دنوں کے لئے ہی چلی چلو......

رضیہ بالکل خاموش رہی۔

بات یہ ہے بھابی، پرویز نے رکتے ہوئے کہا اختر مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا

اب تمہاری تمام ذمہ داریاں مجھ پر ہیں.....

مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی اور نہ ہی اس مکان کو چھوڑنا چاہتی ہوں۔

تو پھر ہم سب یہاں آکر رہنے لگ جاتے ہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

دیکھ لینا بھابی۔

مگر یہ گھر....؟

میں سب کچھ سمجھتا ہوں، تمہیں اس مکان کی ایک ایک اینٹ پیاری ہے۔

پرویز کے منہ سے یہ بات نکلی ہی تھی کہ رضیہ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے..... پرویز نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اچھا بھابی میں آدمیوں کو ساتھ لے کر آتا ہوں رضیہ تکیہ پر منہ رکھے روتی رہی..... تھوڑی دیر میں جب رضیہ کا سامان منتقل کیا جانے لگا۔ تو رضیہ گھر کی جدائی سے نڈھال سی ہو گئی جس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی جس گھر پر کئی سہیلیوں نے اسکا استقبال کیا تھا آج اسی گھر سے وہ غم اور آنسوؤں کی سوغات لیکر باہر جا رہی تھی۔

بڑا دن آیا اور گزر گیا نیا سال آیا اور اپنی بہار دکھا کر چلا گیا.... مگر رضیہ کی آنکھوں میں برسات چھا گئی تھی۔ وہ کبھی روتی کبھی اپنی قسمت کو کوستی..... مگر اسکے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں یونہی سوکھ کر راکھ ہو گئیں اور وہ تنہائی اور رنج و غم کے پھپھولے اپنے دل میں لئے اندر ہی اندر جھلستی رہی..... اور پھر ان زخموں میں پیپ پڑ گئی اور یہ پیپ نہ جانے کب تک رستی رہی۔ رضیہ کی زندگی کس دھارے پر بہہ رہی تھی۔ اس کو پرویز کے تمام گھر والے دیکھ رہے تھے کبھی کبھی پرویز کوشش کرتا کہ وہ رضیہ کے دل سے اختر کی یاد کو اپنے نوکیلے ناخنوں سے کھرچ کر دور پھینک دے اور غریب رضیہ یوں روز روز کی اشک فشانی سے نجات پالے۔

کچھ دنوں سے.........

یاسمین رضیہ سے کچھ ایسی ہل گئی تھی کہ پل بھر کے لئے بھی اسے اپنے سے جدا نہ ہونے دیتی رات ہوتی یا دن یاسمین رضیہ کے قریب بیٹھی باتیں کر رہی ہوتی یا پھر ..... کسی خاص مضمون پہ بحث ہی شروع کر دیتی۔ رضیہ کو بھی یاسمین سے کچھ زیادہ ہی انس ہو گیا تھا وہ بھی یہی کوشش کرتی کہ اسکا زیادہ وقت یاسمین کے ساتھ ہی گزرے

چند دنوں سے یاسمین کی حالت میں ایک نمایاں فرق سا آ گیا تھا اس کا زیادہ وقت تنہائی میں گزرتا۔ وہ اکثر کالج سے آنے کے بعد کتابیں میز پر پٹخ کر نڈھال سی ہو کر بستر پہ گر جاتی..... رضیہ دو تین دن تو یہ دیکھتی رہی آخر ایک دن اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے یاسمین تم آج کل اداس اداس سی نظر آتی ہو"

کچھ نہیں.....؟

نہیں کچھ بات ہے ضرور۔

میں کہہ جو رہی ہوں کہ کچھ بات نہیں۔

رضیہ چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسی بے فکر زندگی میں یاسمین کو ایسا کیا غم ہے جس کی وجہ سے یہ شگفتہ کلی ایک دم زرد پڑ گئی ہے..... کہیں.....؟ نہیں...... ایسا سوچنا پاپ ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ رضیہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ دور دور تک چاندنی بچھی ہوئی تھی ہر چیز دودھ میں نہائی ہوئی نظر آتی تھی۔ چنبیلی کے سفید پھول ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کہ کسی نے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دودھ میں دھو کر جھاڑیوں میں ٹانک دیا ہو سامنے رات کی رانی کا چھوٹا سا پودا خوشبو میں بسا ہوا ہر طرف مستی بکھیر رہا تھا باغ کی درمیانی روش یوں چمک رہی تھی جیسے کسی نے بلور کا ایک فرش سا بچھا دیا ہو قدرت کے اس نکھار اور ہلکی ہلکی چلتی ہوئی ہوا نے ایک عجیب سا سماں باندھ دیا تھا رضیہ اپنی گردن کھڑکی سے باہر نکال کر چنبیلی کے پھولوں کو غور سے دیکھنے لگی وہ بڑی دیر تک انہیں غور سے دیکھتی رہی پھر ایک دم اس کے دماغ میں ایک اذیت سی رینگنے لگی..... یہ پھول ہرگز نہیں ہیں..... یہ کسی مرے ہوئے انسان کے کھلے ہوئے دانت ہیں سفید سفید دانت اور اس چنبیلی کے درخت پر سے ایک مردہ ابھرا اور وہ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا..... پھر اس چنبیلی کو ذرا سی حرکت ہوئی اور وہ مردہ باغ کے مشرقی کونے کی طرف بڑھنے لگا..... رضیہ لرز گئی یہ کیا ہے؟ .... اس نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اس کا تمام جسم کانپنے لگا اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسکے گلے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا ہو اور اسے مردے کی طرف گھسیٹے لئے جا رہا ہو اور وہ مردہ منہ کھولے وہی سفید سفید دانت نکالے اسکی طرف بڑھتا آ رہا ہو..... مگر وہ کچھ عرصہ تک یونہی آنکھیں بند کئے کھڑی رہی..... اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں وہ چاندنی میں نہائے پھول وہیں لٹکے ہوئے جھوم رہے تھے وہ مردہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا رضیہ نے اپنے

الجھے ہوئے بالوں کو زور سے کھینچ کر دیکھا تو تکلیف محسوس ہوئی...... رضیہ سوچنے لگی یہ ابھی ابھی اس نے کیا دیکھا تھا سپنا یا حقیقت مگر یہ سپنا جلد ہی حقیقت کی ایک آہنی ضرب سے پاش پاش ہو گیا اس نے قریبی روش پر قدموں کی چاپ سنی رضیہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی..... اف..... یاسمین اسوقت..... مگر وہ چپ چاپ اندھیرے میں دیوار سے چپکی کھڑی یاسمین کو دیکھتی رہی ــ یاسمین آہستہ آہستہ پھولوں کی قطار کی طرف بڑھتی جا رہی تھی آم کے درخت کے نیچے جا کر یاسمین ایک لمحہ کے لئے رکی اس نے ادھر ادھر گھوم کر دیکھا پھر دھم سے وہاں بیٹھ گئی...... رضیہ بہت پریشان ہوئی کہ یہ آخر یاسمین اسوقت اور اس طرح اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہے..... رضیہ نے اپنا دوپٹہ سنبھالا اور پچھلے دروازہ سے نکل کر چپ چاپ یاسمین کے پاس جا پہنچی یاسمین گھٹنوں پہ جھکی ہوئی کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی رضیہ ذرا اور قریب جا پہنچی اور خود بھی گھٹنوں کے بل دعا میں سر جھکا دیا...... جب یاسمین نے دعا ختم کی تو رضیہ کو قریب دیکھ کر پہلے تو بہت چکرائی...... پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اک دم رضیہ آپا کہہ کر رضیہ سے لپٹ گئی۔

بس اتنی سی بات پر.....

یہ کیا کم بات ہے رضیہ آپا۔

آخر تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے

ایسے ہی

مجھے غیر سمجھتی ہو نا۔

ایسی بات نہیں میری اچھی آپا۔

آخر یہ بات کیا ہے؟

نہ جانے ارشد بھیا نے کالج میں کیا کیا۔

ارشد بھیا کون ؟

آپ نہیں جانتیں وہ دو سال سے کبھی گھر ہی نہیں آئے پچھلے ہفتہ ابا جان ، امی جان سے کہہ رہے تھے "تم نے اپنے سپوت کے کارنامے سن لئے " امی بولیں "بالکل جھوٹ ہے کسی نے تہمت لگائی ہے ۔"

"تیسرے چوتھے دن جو وہ روپے منگوا لیتا ہے آخر وہ جاتے کہاں ہیں سب بری باتوں میں خرچ ہوتے ہونگے اور پرنسپل نے اسے آخری وارننگ دیدی ہے اب اگر اس نے کوئی شرارت کی تو کالج سے نکال دیا جائیگا لو یہ پڑھ لو پرنسپل کا خط" .... اتنا کہہ کر ابا جان ادھر آنے لگے میں جھٹ بھابی جان کے کمرہ میں چلی گئی ۔

"نہ جانے کیا بات ہوئی میرے بھائی جان تو ایسے نہ تھے"

"میں بھی ان کے لئے دعا مانگوں گی وہ ضرور راہ راست پر آجائیں گے"

"خدا کرے آپا آپ کی دعا سنی جائے"

مگر ہوا وہی دوسرے ماہ ارشد صاحب گھر آدھمکے .... رضیہ نے جہاں اتنے دن آرام سے گھر میں گزارے تھے وہاں وہ اپنی شخصیت کو بالکل بھول ہی گئی تھی وہ اپنے آپ کو اس گھر کا ایک فرد سمجھتی تھی مگر ارشد کے دو تین ماہ کے رویہ نے رضیہ کے دل میں کئی قسم کے شکوک پیدا کر دیے تھے مگر وہ انہیں اپنی کمزوری سمجھ کر نظر انداز کر جاتی ۔ یاسمین کا جنم دن قریب آرہا تھا گھر بھر میں خوب تیاریاں ہو رہی تھیں ۔ ارشد پارٹی سے پہلے ایک بنڈل لایا اور بنڈل کو لئے ہوئے وہ بیدھڑک رضیہ کے کمرے میں چلا گیا رضیہ کو اس کی حرکتیں بہت ناگوار گزرتیں مگر وہ ہمیشہ انہیں نظر انداز کر جاتی یاسمین بھی رضیہ کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اس نے ارشد کو بنڈل لاتے دیکھا تو جھٹ سے بنڈل چھین لیا: .... اس میں کیا لائے ہیں بھائی جان ۔

"دیکھ لو ۔"

یاسمین نے بنڈل کھولا تو اسمیں دو ریشمی ساڑیاں نکلیں.....

"یہ کس کے لئے ہیں؟"

"ایک تمہارے لئے..... ایک رضیہ کے لئے۔"

رضیہ نے ارشد کی طرف دیکھا! ارشد کے چہرے پر وحشی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اسکی گلابی آنکھوں میں حیوانیت کا پرتو نظر آ رہا تھا..... "کیسی ہیں رضیہ" ارشد نے رضیہ کے چہرے پر اپنی آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا...... رضیہ کو ایسے لگا جیسے ارشد نہیں بلکہ ارشد کی خودغرضی اس کا سفلہ پن بول رہا ہے..... وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"کیوں پسند نہیں".......

"بہت اچھی ہیں بھائی صاحب" یاسمین بولی۔

"میں تو رضیہ سے پوچھ رہا ہوں۔"

"بہت اچھی ہیں بھائی جان۔"

"تو ایک لے لو نا۔"

"شکریہ.... میرے پاس بہت ساڑیاں ہیں..... اسے آپ بھابی جان کو دے دیں۔"

ارشد چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلا گیا

وقت گزرتا رہا..... اور پھر رضیہ کی زندگی کے گرد گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں..... وہ گھر جسمیں انہوں نے پانچ چھ ماہ ہنسی خوشی گزارے تھے اب اس کے لئے جہنم بنا ہوا تھا...... یوں تو رضیہ کو کسی سے کچھ شکایت نہ تھی پرویز بھائی ہر طرح سے اسکا خیال رکھتے تھے نگہت کو نہ پہلے کچھ دلچسپی تھی نہ اب تھی...... یاسمین پہلے سے زیادہ اب اسے چاہتی تھی۔ والد صاحب اور امی جان کا رویہ بھی وہی تھا

مگر رضیہ کو کچھ خدشہ تھا تو ارشد کی طرف سے تھا کیونکہ ارشد کی دن رات کی بڑھتی ہوئی نوازشوں نے رضیہ کے ایمان کی بنیادیں ہلا دی تھیں جس گھر کو وہ اپنا سمجھتی تھی آج اسے وہی غیر سا محسوس ہوتا تھا۔

دوسرا کرسمس نزدیک آرہا تھا اور رضیہ کو کسی کی یاد دن رات تڑپا رہی تھی اختر اسکی زندگی کا چراغ.... جو ہمیشہ کے لئے گل ہو چکا تھا..... ابھی تک رضیہ کے دل کو منور کئے ہوئے تھا رضیہ کی راتوں کا بیشتر حصہ ان میٹھے میٹھے سپنوں کی آغوش میں بسر ہوتا جو اس نے آج سے ایک سال پہلے دیکھے تھے وہی اختر۔ وہی گھر، وہی تقاضے، وہی غصہ وہی منانا۔ وہی ہنسی ...... سب کچھ ایک حرکت کرتی ہوئی فلم کی طرح اس کے دماغ میں رینگنے لگتا۔ اور رضیہ کئی کئی گھنٹے انہیں مسحور کن خیالوں میں کھوئی رہتی۔ مگر کہیں سے ایک آواز آتی "بڑا دن آرہا ہے" ادھر رضیہ کے محل مسمار ہو جاتے ...... وہ چپ چاپ اپنا ٹرنک کھولتی اور اس کالی ریشمی اوڑھنی کو نکال کر اپنے سینے سے لگا لیتی اور پھر کئی کئی گھنٹے اپنے آنسوؤں سے اپنے تکیہ کو بھگوتی رہتی..... ایک رات......

...... رضیہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے قریب چاندنی کا لطف اٹھا رہی تھی..... چاندنی اپنے شباب پر تھی ہر چیز پر نکھار آیا ہوا تھا اچانک شہر کے گھڑیال نے دو بجا کر رضیہ کو محو خود فراموشی کے عالم سے چونکا دیا...... اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کی اور اپنے پلنگ کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ اس کے کمرہ کا دروازہ آہستہ سے چرچرایا رضیہ نے ٹیبل لیمپ کا سوئچ دبایا تمام کمرہ میں ہلکی سبز روشنی پھیل گئی رضیہ حیران پریشان دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے..... چپ سادھے کھڑی رہی دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا آخر دروازہ پورا کھلا...... "ارشد بھائی!..... آپ اور اس وقت؟؟"..... ارشد دروازہ بند کر کے آگے بڑھا۔

"میں ہوں رضیہ....."

کیا بات ہے؟"

"رضیہ میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میرے تحفوں سے تمہیں اتنی نفرت کیوں؟"

ایسی تو کوئی بات نہیں آپ سے کس نے کہا۔؟

کیا پھر مجھ سے نفرت ہے جو تم انہیں قبول نہیں کرتیں......

"بھلا مجھے آپ سے نفرت کیوں ہوگی...... ارشد نے آگے بڑھ کر رضیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رضیہ کیا تمہارے دل میں میرے لئے ذرا بھی محبت نہیں؟

"ارشد میں ایک بیوہ عورت ہوں میری عزت کا خیال رکھو۔

"کیا ہمارا مذہب بیوہ کو شادی کی اجازت نہیں دیتا۔۔؟"

"دیتا ہے..... اگر دونوں کو منظور ہو تو....."

"تم کیا چاہتی ہو رضیہ؟

"چاہتی ہوں کہ عمر بھر اپنے خاوند کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔"

"مگر دوسروں پر ظلم کرنا بھی انصاف نہیں..... اور پھر مجھ سے کیا قصور ہوا ہے ج
تم مجھ پر ظلم کر رہی ہو؟"

"تم میرے بھائی ہو ارشد۔"

"نہیں.... رضیہ نہیں۔"

"گناہ اور ہوس نے تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے..... اگر آج میرا کوئی بھائی ہوتا، تو کیا وہ مجھ سے ایسی باتیں کرتا؟"..... کیا تم یاسین سے ایسی باتیں کرسکتے
یاد کرو ارشد تم نے پہلے دن مجھے آپا کہا تھا...... کیا تم برداشت کرسکتے ہو کہ تمہارے سامنے تمہاری بہن رضیہ کو کوئی ایسی بات کہے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ رضیہ"

پھر اسکو ختم کیوں نہیں کر دیتے جو تمہاری رضیہ بہن کو ذلیل کرنا چاہتا ہے۔

وہ کون ہے؟....

تمہارے اندر بسا ہوا شیطان..... کیا تم اپنی بہن کی خاطر اس کا گلا دبا سکتے ہو

چپ رہو رضیہ آپا.... تم مجھے پاگل بنا دوگی ۔ میں اسے آج ہی ختم کر دونگا آج ہی اس کا گلا گھونٹ دونگا۔

اور ارشد پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا..... باہر نکل گیا..... صبح تمام گھر میں کھلبلی مچ گئی..... ارشد کہیں چلا گیا تھا..... ارشد کی گمشدگی کا تمام الزام رضیہ غریب پر تھوپا گیا کیونکہ نگہت نے ادھوری سنی ہوئی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر کہہ سنائیں ور تمام گھر والوں کو اس سے بدظن کر دیا۔

اور طوفان کے بعد.....

رضیہ جب سے اس بیوہ خانے میں آئی تھی اسکی زندگی پیپل، انجیل اور اپنے کمرہ تک ہی محدود ہو گئی تھی اس عمر کے بارہ سال اس نے اس بیوہ خانے کی سیاہ کوٹھڑی کی نذر کر دیے تھے بیوہ خانے کی تمام عورتیں طرح طرح کی باتوں میں مشغول رہتیں مگر رضیہ کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا وہ چپ چاپ پیپل کے درخت کے نیچے جا بیٹھتی اور انجیل پڑھتی رہتی۔ کبھی انجیل پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگتے اور وہ چپ چاپ بیٹھی فضا میں کسی چیز کو ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہتی۔

ایک دن ایک منحنی سادھو اس بیوہ خانے کو دیکھنے آئے اور وہ ادھر سے ادھر تک بیوہ خانے کے نگراں کے ساتھ گھومتے رہے ایک کمرہ کے سامنے پہنچ کر نگراں نے اپنی پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ یہاں ایک دیوانی رہتی ہے..... پاگل....؟

ہاں کچھ پاگل ہی سی ہے۔

کہاں ہے وہ....؟

"وہ سامنے پیپل کے درخت کے نیچے"

سادھو اور تمام حاضرین اس دیوانی کو دیکھنے چل دیے ..... ایک دبلی پتلی زرد سی عورت ...... انجیل پر جھکی ہوئی رو رہی تھی۔

"اری رضیہ — دیکھ یہ سادھو جی آئے ہیں۔"

"رضیہ!" سادھو نے آہستہ آہستہ دہرایا۔ رضیہ نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا ...... ایک نورانی چہرہ .... گیرو رنگ کے کپڑے ..... دیکھنے والوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا .......

"رضیہ بھابی ....."

"پرویز بھائی ......"

"پرویز نے سادھو کو اشارہ کر کے کہا .... ارشد۔ یہ رضیہ ہے تمہاری بھابی —!!

"سادھو نے آگے بڑھ کر رضیہ کے پاؤں چھو لیے ....."

"خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو رضیہ بہن تم نے مجھے نیکی کا راستہ دکھایا تھا۔"

رضیہ چپ چاپ وہاں سے اٹھی اور اپنی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی اس نے پلنگ پ پڑی ہوئی چادر کو بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا ..... چادر پر ابتک سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے ...... اور رضیہ آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ اختر .... آجاؤ اختر ..... کی دھیمی دھیمی آوازیں کوٹھری ہی کی فضا میں گم ہو کر رہ جاتی تھیں۔

باہر .... احاطہ میں سادھو جی لوگوں کو مٹھائی بانٹ رہے تھے "لو، بھائی تم بھی لو — لو بہن تم بھی لو ...... آج میری زندگی میں پہلا بڑا دن ہے جسے میں حقیقت میں بڑا دن سمجھ رہا ہوں" — اور شہر کے گرجا کا گھنٹہ — ابھی تک چیخ رہا تھا۔

# شیطان

میری عادت ہے کہ ہمیشہ اپنا دروازہ بند رکھتا ہوں اور اندر سے چٹخنی گرا دیتا ہوں اگر کوئی دروازہ پر دستک دیتا ہے تو میں پوچھتا ہوں "کون ہے" اور ساتھ ہی دروازہ کے نزدیک پہونچ جاتا ہوں۔ اگر دستک دینے والا نام بتاتا ہے تو میں فوراً دروازہ کھول دیتا ہوں کیونکہ اکثر میرے احباب میں سے کوئی نہ کوئی مجھ سے ملنے آتا ہی رہتا ہے۔

ایک اتوار کو عجیب واقعہ پیش آیا۔ بارش ہو جانے کی وجہ سے ہوا میں کچھ خنکی سی تھی۔ مجھے ایسے دن بہت بُرے لگتے ہیں میں اپنی رضائی میں سمٹا سمٹایا بیٹھا تھا اور ماضی کے کھنڈرات میں (جن میں ایک پراسرار اور بھیانک خاموشی کے سوا کچھ باقی نہیں) حسین تصورات کا سہارا لے کر سرگرداں تھا۔ اچانک کسی نے دروازہ پر زور سے دستک دی۔ میرے خوابوں کا رنگین طلسم ٹوٹ گیا۔ فوراً رضائی اتار کر پھینک دی اور چپل پہننے ہی والا تھا کہ پھر دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ جا کر دروازہ کھولا تو دو جھکتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں۔ گلی سنسان پڑی تھی اور پڑوسیوں کے دروازے بند تھے۔

"تشریف لائیے صاحب" میں نے ادب سے کہا اور واپس مڑا۔ کمرہ میں آتے ہی کرسی کو چارپائی کے نزدیک کھسکا دیا اور نووارد سے کہا "تشریف رکھیے

مڑکر جو دیکھا تو حضرتِ شیطان کھڑے مسکرا رہے ہیں کہنے لگے "پہچانا نہیں مجھے۔" میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا "کیوں نہیں صاحب آپ سے تو پرانے تعلقات ہیں۔ کہیے اتنے دنوں بعد کیسے تشریف لائے؟" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر مسکرائے اور اپنی چمکدار آنکھوں سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ "بڑے بدل گئے ہو تم، کیا شغل ہے آجکل"؟

کیوں صاحب آپ سے کون سی بات چھپی ہے۔ آپ نہیں جانتے میں آجکل کیا کرتا ہوں؟"

"جانتا ہوں......"

"تو پھر؟"

"مجھے تمہاری یہ نئی سرگرمیاں پسند نہیں۔"

"آخر وجہ؟"

"مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

"مگر مجھے آجکل بہت تسکین مل رہی ہے۔"

"میں اس سے بھی زیادہ تسکین حاصل کرنے کا طریقہ بتاتا ہوں۔"

"فرمائیے۔"

"کبھی تم نے اپنے گھر کی دیوار سے اس پار جھانکا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"تو اب دیکھنا۔"

کیوں صاحب! ایسی کیا بات ہے؟"

"ادھر ایک حسین عورت رہتی ہے۔ جو تمہارے متعلق بہت سوچتی ہے۔ مگر

تم نہیں جانتے وہ تم سے محبت کرتی ہے۔" مجھے پسینہ آگیا پوچھا "آپ نے کیسے جانا" مجھے خود اسی کی زبانی معلوم ہوا۔ وہ اکثر تمہیں آتے جاتے دیکھتی ہے مگر تم نے کبھی نظر اٹھا کر اس دیوار کے پار دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ فضول آدمی ہو تم۔

"کیوں آپ ....." میں جملہ پورا ابھی نہ کرنے پایا تھا کہ وہ اٹھے اور کھٹاک سے دروازہ بند کرکے چل دیے "ابھی واپس آتا ہوں" وہ چلے گئے اور میں محسوس کرنے لگا کہ وہ چنگاری جو وہ جاتے جاتے میرے دل میں ڈال گئے ہیں مجھے سرتاپا پھونک ڈالے گی۔ دیوار کے اس پار کی عورت جو میرے متعلق سوچتی ہے مجھ سے محبت کرتی ہے میرے ذہن میں شعور بن کر ابھر آئی اور میں چند لمحوں کے لئے اپنے ماحول سے بے نیاز ہو گیا۔ ہوا کا ایک جھونکا ٹین کی چھت سے ٹکرایا اور میں اس کھڑکھڑاہٹ سے چونک اٹھا دروازہ بند کیا اور پھر آنگن میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

آسمان صاف تھا تاروں کی دنیا آباد ہونے والی تھی۔ دیوار پر نظر ڈالی وہ بدستور اپنی جگہ قائم تھی۔ چارپائی کو دیوار کے سہارے لگا کر اوپر چڑھا اور دھڑکتے ہوئے دل اور امید افزا آنکھوں سے اس پار جھانکا۔ آنگن شفاف بلور کی طرح جھلک رہا تھا۔ اور پراسرار خاموشی تمام ماحول پر محیط تھی۔ مایوس ہو کر نیچے اترا اور پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا چند لمحوں کے بعد دیوار کے اس پار پازیب کی جھنکار سنائی دی پھر فوراً بعد ہی چوڑیاں کھنکیں اور پھر وہی خاموشی۔ ہمت کا سہارا لے کر پھر چارپائی پر چڑھا اور دیوار کے اس پار ڈرتے ڈرتے جھانکا۔ وہ رسی پر گیلے کپڑے لٹکا رہی تھی پشت میری جانب تھی۔ اچانک جو مڑی تو میری پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسکی نگاہیں ملیں۔ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ پھر ایک بار مجھے دیکھا اور کمرے میں داخل ہو گئی۔ چند لمحوں بعد دوسرے دروازے سے جھانکا۔ میں مسکرایا وہ بدستور اداس اداس آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے قریب آنے کا اشارہ کرنے کو ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ کسی کے

آنے کی آہٹ ہوئی اور پھر ایک آہنی ہاتھ نے دیوار کے پچھلی طرف سے اچک کر میرے سر کے بال اپنی مضبوط گرفت میں لے لیے اب میں جو یکدم گھبرایا اور لڑکھڑایا چارپائی اپنی جگہ سے کھسک گئی اور دھڑام سے فرش پر جا گری۔ اور میں دیوار کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ یوں کہ سر اور کاندھے دیوار کے اس طرف اور دھڑ اور ٹانگیں اس طرف چیخوں تو اپنی حماقت کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ خاموش رہوں تو تکلیف برداشت نہیں ہوتی اچانک کسی نے زور کا جھٹکا جو دیا تو دھڑام سے کمر کے بل اپنے آنگن میں آگرا۔

درد کی شدت سے سر گھوم رہا تھا۔ ہاتھ جو پھیرا تو سر پر سے بالوں کا ایک گچھا غائب تھا۔ غصہ اور غم کی حالت میں ایک دبی سی چیخ جو نکلی تو گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا کہ منٹو کی تازہ تصنیف ٹھنڈا گوشت سینے پر چپکی پڑی ہے اور نزدیک ہی میز پر انجیل گرد سے اٹی پڑی ہے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اسے اٹھایا اور بے خود ہو کر سینے سے لگا لیا۔ تمام جسم پسینہ سے شرابور تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔ آواز آئی میں یہاں ہوں۔ میں نے لپک کر اسے گردن سے پکڑ لیا اور اس زور سے دبایا کہ وہ مر گیا اب میرا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

# ہنستے آنسو

کواڑ زور زور سے بجنے لگے، پھر ایک بار ہوا کا جھونکا جو زور سے آیا تو بوسیدہ کائی سے اٹے ہوئے کواڑ خود بخود کھل گئے ڈورتھی نے ایک بوجھل سی نظر باہر ڈالی اور سسکتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔ پھر چولہے کے پاس آ بیٹھی، راکھ میں کہیں کہیں انگارے چمک رہے تھے یونہی اس نے پلٹ کر اندر کمرے میں جھانکا، مارگریٹ دیئے کی لو کی کانپتی ہوئی روشنی میں کچھ پڑھ رہی تھی۔ "مارگریٹ کتنی بڑی ہوگئی ہے۔" اور پھر ایک ننھی سی گڑیا چھ سال کی۔ اف کیا دن تھے ڈورتھی آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی اس نے پھر راکھ کو کریدا انگارے جو کاسنی راکھ میں سوئے پڑے تھے ایک بار پھر چمک اٹھے اور خیالات کے طوفان ایک دفعہ پھر اسے بہا لے گئے۔ پاپا میری شادی کی بات کر رہے تھے کئی لڑکے میرے لئے منتخب ہوئے اور پل کی پل میں کسی کو آوارہ، کسی کو نااہل کہہ کر ناقابل ٹھہرایا گیا۔ نہ جانے ماما کی پسند کیسی تھی کہ آٹھ دس لڑکوں میں سے ایک بھی انہیں پسند نہ آیا، اور پھر کس افسردگی سے ماما نے کہا تھا۔

میں چاہتی ہوں کہ لڑکی میٹرک پاس کرلے پھر دیکھا جائے گا۔

مگر میں چاہتا ہوں کہ جلد اس کی شادی ہوجائے۔

اور یہ شادی کی بات چلتے چلتے ماما اور پاپا کے جھگڑے میں مدغم ہو کر رہ گئی

ڈورتھی نے آہستہ آہستہ سر اوپر اٹھایا، کیسے کیسے خیالات اسکے ذہن کو پراگندہ کر رہے تھے۔ اس نے گھوم کر دوبارہ مارگریٹ کی طرف دیکھا، دیا جل رہا تھا اور مارگریٹ اوندھے منہ سو رہی تھی۔ ڈورتھی آہستہ آہستہ اندر گئی تاکہ دیے کو بجھا دے باہر ہوا سراٹے بھر رہی تھی دور بانس کے گھنے جنگل میں سے سیٹیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بچپن میں وہ انہی آوازوں سے ڈرا کرتی تھی۔ وہ دیا بجھانے ہی کو تھی کہ باہر کسی نے زور سے زنجیر ہلائی۔ کون ہو سکتا ہے اسوقت؟ وہ ایک لمحہ کے لئے سوچنے لگی ایک بار زنجیر پھر زور سے بجی اور ساتھ ہی آواز آئی

"کوئی صاحب اندر ہیں؟"

آدھی رات گئے اس طوفان میں...... ڈورتھی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا باہر ایک لمبا سا سایہ کھڑا تھا۔

"میں اندر آسکتا ہوں؟"

"آئیے"

ڈورتھی نے کانپتی سی نظر سے طوفان کو دیکھا۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ ایک خوبصورت سا نوجوان بارش میں بھیگا ہوا اس کے مقابل کھڑا تھا۔

"محترمہ میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو اتنی رات گئے تکلیف دی میں پردیسی ہوں صرف یہ رات بسر کرنا چاہتا ہوں کئی جگہ پوچھا مگر کسی نے بھی میری حالت پر رحم نہیں کھایا اب اگر آپ بھی نہیں چاہتیں تو میں کوئی اور جگہ تلاش کرنے کی کوشش کروں"۔

بجلی زور سے کوندی اور کھڑکی کے باہر کی تمام چیزیں ایک پل کے لئے نظر آئیں اور پھر ان پر اندھیرا چھا گیا۔

آپ میرا یقین کیجیے میں کوئی چور یا......

ڈورتھی نے ایک نظر نوجوان کے چہرے پر ڈالی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنے پلنگ پر

ایک سفید چادر بچھا دی تاکہ پردیسی اس پر آرام کر سکے، آپ کپڑے بدل لیجیے بہت بھیگ گئے ہیں۔

"میں کچھ دیر آگ تاپنا چاہتا ہوں"

"ضرور اور میں آپ کے لئے چائے تیار کئے دیتی ہوں"

مسافر بالکل خاموش رہا۔ دیگچی میں پانی چڑھا کر ڈورتھی خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ مسافر نے آگ تیز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ ؟"

"میں اکیلی نہیں ہوں۔ مسیح میرے ساتھ ہے اور پھر دو چھوٹی بہنیں"

"کوئی مرد؟"

"مرد تھا صرف ایک باپ جس کے دل میں بچوں کی محبت کے بجائے شراب اور جوے کی لگن تھی وہی مرد ہم سے ہماری ماما کو چھین لے گیا...... سردیوں کی ایسی ہی ایک بھیانک رات میں وہ ہمیشہ کے لئے ہمیں چھوڑ گئی۔"

نوجوان نے ڈورتھی کے چہرے پر چھائے ہوئے غم کے غبار کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"اور تمہارے پاپا؟"

شراب کی بڑھتی ہوئی پیاس نے انہیں بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل کر دیا دنیا کی ہر خوشی ہمارے سامنے ناکامی کا پہاڑ بن کر کھڑی ہو گئی لیکن شکر ہے مسیح کا جس نے میری مدد کی۔ میں نے میٹرک بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا اور جلد ہی نرسنگ کے لئے چلی گئی۔ ایک مشنری خاتون نے میری دونوں بہنوں کو اپنے خرچ پر اسکول میں داخل کرا دیا اور جب تک میں نے ٹریننگ حاصل نہ کر لی وہی محترمہ ان کا خرچ برداشت کرتی رہیں پھر میری زندگی کا نیا دور شروع ہوا اور میں نے بارہا سوچا

کہ کیوں نہ میں شادی کرلوں اپنا گھر بسا لوں مگر ان دو چھوٹی بہنوں کی پرورش کا خیال آتے ہی مجھے اپنے ارادوں کو بدلنا پڑا۔ کئی بار زندگی میں تاریک لمحات آئے اور مجھے بارہا محسوس ہوا کہ میں ہمیشہ کے لئے اس خوفناک اندھیرے میں گم ہو کر رہ جاؤنگی مگر ان بچوں کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا۔ وہ سارے گزر گئے وہ دن بیت گئے میں اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا گلا گھونٹ کر مسکراتی رہی اب یہ جسم فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اب نہ کوئی تمنا جوان ہے نہ کوئی ارمان زندہ۔ اگر کچھ ہے تو بس ان بچوں کی زندگیاں بنانے کا ارمان اور ان کو پروان چڑھتے دیکھنے کی تمنا۔ مجھ سے چھوٹی اب کافی بڑی ہو چکی ہے وہ اسال آٹھویں پاس کرے گی۔ پھر میرا خیال ہے اس کی شادی کردوں میرا کیا ہے جی رہی ہوں ان بچوں کو دیکھ کر ان کی بے پناہ مسرتوں کا اندازہ کر کے قہقہے لگا لیتی ہوں۔ ان کی زندگی میری زندگی ہے ان کی مسرت میری مسرت ہے۔

ایک بار پھر بجلی چمکی اور وہ چونک اٹھی ..... "مسافر مجھے معاف کرنا میں اپنی بے کیف داستان میں تمہارے آرام کو بھول گئی، رات کافی بیت گئی اب تمہیں سو جانا چاہیئے"

صبح سویرے ڈوربھی اٹھی اس نے مسافر کی چارپائی پر نظر ڈالی وہ جا چکا تھا ڈوربھی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بستر سمیٹنا شروع کیا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے تکیہ کے نیچے نوٹوں کا ایک بنڈل دیکھا۔ شاید وہ بھول گیا وہ سوچنے لگی اور بنڈل کو اٹھا لیا ایک پرزے پہ لکھا تھا کہ "غمزدہ بہن یہ ناچیز تحفہ ایک بھائی کی طرف سے قبول کر لینا"

باہر ہوا چل رہی تھی سورج نکل چکا تھا مگر کہیں کہیں ہلکے ہلکے بادل بھی

بھاگ رہے تھے۔ ڈورتھی نے گھوم کر چرچ کی طرف دیکھا نوجوان کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ "مسیح تمہیں تا قیامت زندہ رکھے" اسکے دل سے دعا نکلی اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا اور ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل تھامے وہ اندر چلی گئی اور بے اختیار ہوکر مارگریٹ کو چوم لیا۔

---

# سویرا

آشا نے چادر کا ذرا سا کونا سرکا کر دیکھا۔ منوہر مست پڑا سو رہا تھا پھر اس نے ایک نظر کھڑکی سے باہر ابھرتے ہوئے سورج پر ڈالی اور پلنگ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی باہر کوّوں اور کبوتروں کی ٹولیاں ہوا کے دوش پر رقص کرتی ہوئی شمال کی جانب اڑی جا رہی تھیں۔ ایک کوّا بیری کے ٹنڈ منڈ درخت سے اڑ کر مالی کے صحن میں پہنچا سامنے مالی کا کالا کلوٹا لڑکا کلّو ہاتھ میں روٹی لئے کھڑا کھا رہا تھا کلّو کی کمر کے گرد ایک کالا سا دھاگا لپٹا ہوا تھا ایک دم کوّا جھپٹا اور کلّو کے ہاتھ سے روٹی چھین کر دیوار پر جا پہنچا۔ آشا نے گھوم کر اندر باورچی خانہ میں دیکھا۔ انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے نوکرانی شاید نلکہ سے پانی بھر رہی تھی آشا نے ایک انگڑائی لی اور کمرے میں اپنی ماں کو گھٹنوں کے بل جھکتے دیکھا۔ شاید وہ اپنے مسیح سے کچھ مانگ رہی تھی آشا سوچنے لگی یہ بڑھیا چوبیس گھنٹے گھٹنے کیوں رگڑتی رہتی ہے۔ جب دیکھو انجیل۔ 'دعا' آخر اسے ملتا کیا ہے۔

پھر آشا کو یوں لگا جیسے وہ اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے گھسیٹ رہی ہے اسکے زانوؤں پر رکھی ہوئی انجیل کے اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور وہ اپنی ماں کو گھسیٹتی گھسیٹتی اپنے کالج کے کامن روم میں لے گئی ...... ادھر ادھر اسکی سہیلیاں تھرک رہی ہیں اور اس کی ماں انجیل اور اپنے مسیح کو فراموش کر کے

اس کی سہیلیوں کی رنگ رلیاں دیکھنے میں مشغول ہو گئی۔ آشا سکرا اٹھی کیسے کیسے خیالات اسے آتے ہیں نہ جانے ایک دم آشا کو کیا سوجھی۔ اس نے برش اٹھا کر سامنے والی کھڑکی کے شیشے پر دے مارا۔ آشا کی ماں دعا سے ایک دم چونک اٹھی "کیا ہوا بیٹی؟......

شیشہ توڑ دیا.....

کس نے توڑا؟

کلو کمبخت نے..... آج آنے دو اس کمبخت کو اس کی ہڈی پسلی نہ برابر کر دوں تو..... آشا کی ماں نے آشا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "چل بیٹی کبھی انجیل پڑھ لیا کر"......

انجیل سے کیا ہوتا ہے ماں.......

آشا ماں اور انجیل کا تمسخر اڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آشا کی چھوٹی میز پر انجیل! آشا آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے انجیل اٹھا کر دیوار پر دے ماری "انجیل۔ انجیل جدھر دیکھو انجیل..... ہر طرف مسیح۔ خدا واعظ، لیکچر یہ سب بکواس ہے۔" آشا کے سینے میں تاریکی کا ایک طوفان ہزاروں آندھیوں اور بجلیوں کے ساتھ بھڑک اٹھا۔ اس کی سانس پھول گئی...... "میں زندہ نہ رہ سکوں گی اس ماحول میں..... یہ انجیل میری مسرتوں کو لوٹ لیگی اور آشا نے اپنے سر کو تھام لیا۔ کسی کے کمرے سے باہر جانے کی آواز نے آشا کو چونکا دیا اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی ماں انجیل کو سینہ سے لگائے باہر جا رہی تھی۔

آشا کے قدم دن بدن ان اندھیرے غاروں کی طرف بڑھتے گئے اور وہ اس اندھیرے کو اپنی قسمت کا اجالا تصور کرتی رہی کالج گھر پارک سب اسکی عیاشیوں کے مرکز تھے حتیٰ کہ چرچ میں آشا کی جوانی اور امنگیں انگڑائیاں لے لے کر

اسے گناہوں کی تاریک وادیوں میں گھماتی رہتیں آشا محلہ بھر میں وہ لڑکی تھی جس پر کسی نیکی کا گمان تک نہیں کیا جاسکتا تھا ماں باپ کی نصیحت اسکے لئے بے سود تھی

دسمبر کے اداس اور تنہا شب و روز کے درمیان ایک ایسا دن بھی آیا جب آشا کی سولہویں سالگرہ منائی گئی محلہ بھر کے سبھی اس دعوت میں شریک ہوئے۔ طرح طرح کے تحفے آشا کی میز پر پڑے ہوئے تھے مگر آشا کی نظر صرف ایک چھوٹے سے تحفہ کی نذر ہو چکی تھی وہ سخت بے چین تھی۔ تمام تحفوں کو جلد از جلد کھولنے کے بعد اس نے سنہری کاغذ کے بنڈل کو کھول کر دیکھا اس میں نیا عہد نامہ تھا۔ اس نے یہ تحفہ میز پر پٹخ دیا۔ دھم سے ایک آواز پیدا ہوئی آشا اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ انجیل کیوں بار بار اس کے سامنے آتی ہے۔ اسکی نظروں میں ایک بوڑھے کا چہرہ گھوم گیا جس نے ابھی چند گھنٹے پہلے یہ چمکتا ہوا تحفہ اسے دیا تھا...... وہ چہرہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور پھر اس چہرے کے گرد آشا نے ایک عجب نور دیکھا یہی نور کبھی کبھی وہ اپنی ماں کے چہرہ پر دیکھا کرتی تھی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی...... اس نے بتی جلائی اور اسکے ہاتھ خود بخود اس کتاب کی طرف بڑھ گئے۔ ندامت کے آنسوؤں کا سیلاب آشا کی آنکھوں سے بہ نکلا۔

صبح کی دعا مانگتے ہوئے اس نے محسوس کیا کوئی اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ آشا نے آنکھیں کھولیں اس کی ماں کا مسکراتا چہرہ اس کی بھیگی آنکھوں کو چوم رہا تھا...... کھڑکی کے باہر سویرا پھوٹ رہا تھا مگر آشا نے اس سے کہیں زیادہ فرحت بخش سویرا اپنی زندگی میں ابھرتا ہوا محسوس کیا....... اور سچ مچ یہ سویرا ایک نیا اجالا بن کر آشا کی زندگی پر ہمیشہ کے لئے چھا گیا۔

محلے کے کچھ لوگ حیران تھے کچھ کہہ رہے تھے خدا کے کھیل عجیب ہیں کل لڑکی کیا تھی اور آج کیا ہو گئی ہے ........ ہر گھر میں آشا کا چرچا تھا مگر آشا ان باتوں سے دور چرچ میں بچوں کو یسوع مسیح کی دلچسپ کہانی سنا رہی تھی۔

# شفق کے اُس پار

رات بھیانک اندھیری اور خوفناک تھی پھر فسادات کے دن اپنے تمام ظلم و تشدد سمیت لپکے چلے آرہے تھے۔ آدیس خاموش بستر پر لیٹی تھی۔ بم پھٹ رہے تھے گولیوں کی بھیانک آوازیں فضا کو چیرتی ہوئی آدیس کے کانوں میں گھسی جارہی تھیں وہ باربار چونک پڑتی اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی سوائے ننھے پرسل کے جو بمشکل پانچ برس کا تھا اس کا کوئی ہمدرد اور ساتھی نہ تھا وہ ایک اسکول میں استانی تھی ماں مرچکی تھی اور باپ لاپتا تھا ماں کے مرنے کے بعد جانے وہ کہاں چلاگیا تھا اور اب وہ اتنا بھی نہ جانتی تھی کہ اس کا باپ زندہ ہے یا مرگیا ہے اور اس واقعہ کو تین سال کا طویل عرصہ گزرچکا تھا وہ صرف اپنے اور ننھے بھائی کے بارے میں جانتی تھی اور بس باقی دنیا سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

یہ بھیانک آوازیں سن سن کر آدیس گھڑی گھڑی کانپ جاتی ابھی آزادی ملی اور وہ آزادی کی رنگینیوں میں گم ہو کر سوچنے لگی اچانک اسے وہ بھیانک واقعہ یاد آیا۔ منگل کی شام کو وہ اسکول سے لوٹ رہی تھی تو ایک لڑکے نے اسے کچھ نامناسب الفاظ کہے آدیس خاموش رہی اور وہ بدمعاش جانے کیا سمجھ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب آدیس نے غصہ سے لال پیلی ہو کر اسے جھڑکا تو اس نے زور سے آدیس کے منہ پر تھپڑ رسید کیا۔ آدیس بھی غضبناک ہو کر اس سے الجھ پڑی

اور پھر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ یہ سوچ کر آدیس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے یہ اولین واقعہ تھا کہ ایک ذلیل لڑکے نے اسکی بے عزتی کی تھی یہ سوچ کر وہ غصہ سے کانپنے لگی اور فرط غضب سے اسکے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہو گئیں کاش وہ اتنی طاقتور ہوتی کہ اس کمینے کا گلا گھونٹ سکتی اور اسے جان سے مار دیتی۔ مگر افسوس وہ کمزور تھی ایک نسوانی پیکر، بھلا اسکا مقابلہ کیسے کرتی کاش وہ انتقام لے سکتی انتقام کی آگ اسکے نازک سے دل میں بھڑک اٹھی اور وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی

وہ سوچنے لگی اگر وہ شادی کر لیتی تو اچھا ہوتا اور پھر اسکا خاوند اس ذلیل لڑکے کی ایک ایک پسلی چور کر سکتا مگر فوراً ہی اسکے سامنے ننھے پرسل کا معصوم چہرہ آ گیا اگر وہ شادی کرلے تو یہ بیچارہ شاید ان پڑھ اور گنوار ہی رہ جائے نہیں نہیں ایسا کیوں ہونے لگا بھلا۔۔۔۔ اسنے ایک بار پھر قسم کھائی کہ وہ اپنی زندگی کی تمام مسرتیں پرسل کی خاطر قربان کر دیگی اور اگر اسکی جان بھی پرسل کے کسی کام آ سکے تو وہ دریغ نہ کریگی مگر ان تمام باتوں کے باوجود دنیا والے اسے جینے نہیں دیتے زندگی کی اس کٹھن راہگزر پہ پریشان حال پھرتے پھرتے کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ لے مگر ہر بار وہ پرسل کی خاطر جینے پر مجبور ہو جاتی اور سوچتی، خودکشی تو بزدلی ہے بیچارہ پرسل کہاں رہے گا۔ آدیس خیالات کی رو میں بہتے بہتے جانے کہاں پہنچ گئی

---

اچانک باہر گلی میں چیخوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں اور اسکے دروازہ کے قریب بھی کوئی چیخا "بچاؤ ہائے مجھے بچاؤ" آدیس گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اس کے قدم خود بخود دروازہ کی جانب اٹھ گئے جوں ہی اس نے دروازہ کھولا ایک نوجوان خون میں لت پت گرتا پڑتا تیزی سے اندر آ گھسا "خدا کے لئے مجھے بچایئے اور پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔ گلی میں موڑ کے اس طرف شور و غل کی صدائیں تیز تر ہو گئیں اور آدیس نے گھبرا کر دروازہ بند کر لیا

انتہائی پریشانی کی حالت میں آدیس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئی اس کے تمام کپڑے خون میں لت پت ہو رہے تھے اور ایک ہاتھ میں گہرا زخم تھا آدیس نے

رحم اور ہمدردی کے جذبہ سے سرشار ہو کر نوجوان کو اپنے دونوں بازوؤں پر اٹھا لیا اور اندر پلنگ پر ڈال دیا۔ روشنی میں آدیس کی نظر نوجوان کے چہرہ پر پڑی وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئی اسے وہ صورت کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اس کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل گئی یہ وہی ذلیل لڑکا تھا جس نے گزشتہ ہفتہ آدیس کی بے عزتی کی تھی نفرت اور انتقام کی آگ اسکے دل میں بھڑک اٹھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اسکے منہ پر نفرت سے تھوک دے اور ذلت کی سیاہی اسکے چہرہ پر مل دے نمک لے کر اس کے ایک ایک زخم میں بھر دے اور جب وہ درد کی شدت سے چلائے تو یہ قہقہے لگائے اور جب وہ پانی مانگے تو یہ نفرت سے منہ پھیر لے جب اس کے دشمن اسے ڈھونڈتے ہوئے آئیں اور گلی میں سے گزریں تو وہ چلا چلا کر کہے یہ ہے تمہارا شکار آؤ میری آنکھوں کے سامنے اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دو اور ایک چھرا مجھے بھی دو جو میں اسکے دل میں قبضے تک اتار دوں اور یوں اپنی تمام بے عزتی کا انتقام لے لوں انتقام کے یہ جذبات اسکے دل اور دماغ میں تیزی سے کھول رہے تھے اور وہ عجیب تذبذب کی حالت میں اس نوجوان کے نزدیک کھڑی تھی اچانک پرسل نے آہ بھری اور کروٹ بدلی ایک لمحہ کے لئے آدیس کی توجہ پرسل کی طرف لگ گئی اسے اپنا بھائی کس قدر عزیز تھا اس کی ذرا سی تکلیف بہن کے لئے ہزارہ بے چینیوں کے برابر تھی پھر فوراً دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں اس نے عورتوں اور بچوں کے دلدوز نالوں کی صدائیں سنیں اور اس کی آنکھوں کے سامنے روتی اور چلاتی ہوئی ہزاروں بہنوں کے پژمردہ چہرے ابھر آئے جن کے بھائیوں کے جسموں کے کئی کئی ٹکڑے کیے گئے تھے اس کا سر گھومنے لگا اور دور کسی محلہ میں آگ بجھانے والے انجن کے گھنٹے بجنے لگے وہ لمحہ لمحہ تیز تر ہوتے گئے آدیس کو معلوم ہوا جیسے لاہور کے تمام گرجوں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے اور ہر طرف سے

صدائیں آنے لگیں "اپنے دشمنوں کو پیار کرو" وہ بے چین ہو گئی سامنے دیوار پر تصویر میں مسیح اپنی صلیب اٹھائے جا رہا تھا اور دشمن اس پر تھوک رہے تھے وہ گھبرا کر مڑی اور پانی لینے دوڑی۔

چند لمحوں بعد جوان نے آنکھیں کھول دیں آدیس پر نظر پڑی اسے پہچان لیا اور ندامت کے پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے شرم سے اس کی آنکھیں جھک گئیں کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ زبان تک نہ پہونچ سکے آدیس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دودھ گرم کرنے اٹھی فوراً ہی باہر گلی میں بہت سے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں ادھر دودھ گرم ہوا ادھر دروازے پر ہتھوڑے پڑنے لگے اور ساتھ ہی درندے چیخ رہے تھے "کھولو دروازہ نہیں تو توڑ دیا جائے گا" آدیس گھبرا کر اٹھ بیٹھی نوجوان کا ہولناک حشر اسکے سامنے تھا اس پر نظر پڑی تو اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو رحم و کرم کی بھیک بن کر امڈ آئے تھے اور واقعی آدیس کو رحم آگیا جرات اور حوصلہ کو دل میں جمع کرتے ہوئے وہ چیخی "کیا بات ہے؟ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" کئی آوازیں آئیں "ہمارا شکار اندر ہے تم نے اسے پناہ دی ہے۔ دروازہ کھولو۔" آدیس پر لرزہ طاری ہو گیا اسے محسوس ہوا جیسے ہلاکت اور بے دردی کے خوفناک بھوت دروازہ توڑ کر اندر آ گئے ہیں۔ پھر دروازہ پر ہتھوڑے چلنے لگے اور آدیس بے حد پریشان ہو کر کمرہ کی طرف دوڑی دروازہ بند کیا۔ برسل بھی جاگ اٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا آدیس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے باہر کا دروازہ کھولا۔ کتنے ہی بے درد باہر کھڑے تھے چند آدمی اندر گھس آئے آدیس دوڑ کر کمرے کے دروازہ کے باہر کھڑی ہو گئی۔ کوئی بولا "پگلی کیوں اپنی جان کھونا چاہتی ہے ہٹ جا اب اسے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا" مگر آدیس اور بھی جم گئی۔ ایک بولا "مارو اس کمبخت کو بھی" ٹرن

ہمدردی کرنے چلی ہے۔" آدتیس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اس کا رواں رواں کانپنے لگا ہزاروں چیخوں اور آہوں میں لپٹی ہوئی آواز سے اس نے کہا خدا کے لئے اسے مت مار دو وہ پہلے ہی موت کے دروازہ پر ہے مجھے مار ڈالو مگر اسے چھوڑ دو۔ اس پر ایک درندے نے جھپٹ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور ایک طرف ڈھکیل دیا وہ جھنجلائی بے قابو ہو گئی اور مردانہ وار اندر گھس گئی۔ کئی چھرے اور چاقو نوجوان کے جسم سے پار ہو چکے تھے اور آدتیس بھی خون میں نہائی ہوئی ایک طرف پڑی تھی۔

اب پرسل اسکول میں پڑھتا ہے مگر اکثر شفق کے پار دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ شفق کی سرخیوں میں اسے آدتیس مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔

# کونپل

ہماری پہلی ملاقات ایس سی ایم[1] کے ڈسکشن گروپ میں ہوئی۔ عام طور پہ کالج میں مسیحی لڑکوں کو بائبل سے ذرا کم دلچسپی ہوتی ہے اور یہی حال لڑکیوں کا تھا مگر میری حیرانی کی حد نہ رہی جب وہ بار بار اٹھتی سوال کرتی، اور تجسس آمیز نگاہوں سے پروفیسر داس کی طرف دیکھتی میں محسوس کر رہا تھا کہ لڑکوں پر ایک پراسرار خاموشی طاری تھی جو دراصل انکی بائبل سے ناواقفیت کا اظہار تھی مجھ سے نہ رہا گیا اور قبل اسکے کہ وہ سوال کرنے اٹھتی میں کھڑا ہو جاتا اور سوال کرتا جواب پاتے ہی پھر سوال کرتا اور وہ مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھتی جو کہہ رہی ہوں "ہمیں بھی بولنے دو" اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیتا "تم نے اپنا فرض ادا کر دیا" بحث کے خاتمہ پہ پروفیسر داس نے خاص طور پہ ہم دونوں کا شکریہ ادا کیا — ہال سے باہر نکلتے ہی اس پر نظر پڑی وہ لڑکیوں میں گھری ہوئی کسی سوال پہ بحث کر رہی تھی ہم لوگ نزدیک سے گزرنے لگے تو اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم سب رک گئے کہنے لگی "مسٹر سیم بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی بائبل کی واقفیت غیر معمولی ہے مجھے امید ہے ہمارا ڈسکشن گروپ اچھا رہے گا" شکریہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا اور وہ سب دوسری طرف مڑ گئیں ہم ہوسٹل چلے آئے۔

---

1. Students' Christian Movement.

ایک روز پرنسپل صاحب نے بلایا اور میں کچھ خوف اور گھبراہٹ کے ملے جلے وسوسے دل میں لیے ہوئے پہنچا ـــ برآمدے میں وہ کھڑی تھی۔ میری غیر متوقع آمد سے کچھ گھبرائی اور پھر فوراً ہی رسمی دعا سلام سے بات شروع ہو گئی۔ میں نے پوچھا "تم کیسے آئی ہو" کہنے لگی "پرنسپل صاحب نے بلایا ہے۔

عجیب بات ہے مجھے بھی پرنسپل صاحب نے بلایا ہے۔

ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے "ایسا کیا کام ہوگا؟" میں نے پوچھا اس کا خیال تھا شہر میں سنڈے اسکول کے کام کے بارے میں بلایا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر کے سنڈے اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے اور واقعی جب ہم دونوں پرنسپل سے مل کر باہر نکلے تو بہت خوش تھے خدمت کرنے کا موقع ملا اور ساتھی بھی ایسا پایا کہ مردہ حوصلے جی اٹھے۔ اتوار کو چلنے کا وعدہ کر کے میں ہوسٹل چلا آیا اور وہ گھر چلی گئی

ہوسٹل کے مسیحی لڑکے مجھے پادری کہتے اور خوب دق کرتے اور کچھ ایسے بھی تھے جو واقعی میری عزت کرتے تھے سنڈے اسکول کے کام کے لیے پرنسپل کی نظر انتخاب جو مجھ پر پڑی تو بہت سے دل جلے کالج میں افواہیں اڑانے لگے۔ ان کے نزدیک حیرت افزا بات یہ تھی کہ ایک لڑکی اس کی ساتھی ہے دیکھنا کیا کیا گل کھلتے ہیں لیکن میں انتہائی صبر و سکون کے ساتھ اپنے دن گزار رہا تھا۔

اتوار کو ہم شہر کے چرچ میں ملے پرنسپل صاحب کی میم صاحبہ سنڈے اسکول کی انجارج تھیں وہ عورتوں کو بائبل پڑھاتی تھیں۔ اس دن میں نے لڑکوں کی جماعت کو پڑھایا اور اس نے لڑکیوں اور بچوں کو مشغول رکھا۔ عبادت کے بعد وہ مجھ سے کہنے لگی "کہو کیسا کام ہے پسند آیا؟" میں نے کہا "مجھے خدمت سے غرض ہے

پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" کہنے لگی "آپ کے خیالات اچھے ہیں" ہم باتیں کرتے کرتے باہر نکل آئے کہنے لگی "اتنی جلدی ہوسٹل جا کر کیا کرو گے چلو میرے گھر کچھ وقت گزر جائے گا سب سے ملاقات کر لینا"

اس کے دونوں بھائی فوج میں تھے والدہ ضعیف اور کمزور تھیں۔ جس خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا گیا کچھ میں ہی جانتا ہوں اور پھر ان چند گھنٹوں کی ملاقات میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہو گئے کہ رسمی طرز خطاب کا احساس تک نہ رہا مجھے محسوس ہوا یہ لڑکی ایسے پاک دل کی مالک ہے جو کسی کسی کو میسر ہوتا ہے اور سچ میں نے اسی دن سے اپنے تمام ناپاک ارادے دفن کر دیے کیوں نہ میں بھی ایسا دل حاصل کروں جس پر فریب اور دھوکا کارگر نہ ہو سکے میں یتیم اور بے یار و مددگار تھا کالج میں مفت تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اب جب بہنوں جیسا پیار اور ماں جیسا اظہار محبت نصیب ہوا تو میری زندگی مسرتوں کا گہوارہ بن گئی اس دن سے میں اس کے لئے نسیم بھائی بن گیا۔

---

ہمارے مخالف طوفان بن بن کے ٹکراتے اور ہم مردانہ وار گزر جاتے جہاں گناہ کا احساس تک نہ ہو وہاں بھلا بدنامی کا کیا خدشہ؟ ہماری بول چال ہمارا سلوک کچھ ایسا تھا کہ امتحان لینے والوں نے ہر طور سے ہمیں کامیاب پایا اور یوں ہم نے اپنے نئے کالج کے ماحول میں ایک مخصوص جگہ بنا لی۔

---

ایک دن وہ ٹک شاپ میں دیگر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی میں ادھر سے گزرا تو پکڑا گیا۔ کہنے لگی "پاگل ابھی سے پیسے جمع کرنے لگا ہے کیا کرے گا ان کا؟" میں نے کہا "بیشک خدا کی دنیا بہت وسیع ہے مگر نکموں کو کچھ نہیں ملتا" کہنے لگی "اچھا بیٹھو تو سہی"

میں نے کہا "تم لوگ چائے پیو میں تو پیتا ہی نہیں ہاں بیٹھ جاتا ہوں۔" سب نے اصرار کیا اور ناچار چائے پی لی گفتگو کے دوران کئی بار اس نے مجھ سے پوچھا "کون سے بنک میں جمع کرتے ہو"؟ میں نے قریب ہو کر آخر ایک بار کہہ ہی دیا "کیوں میری بے عزتی کر رہی ہے پگلی سب لڑکے سن کر ہنس رہے ہیں ہوسٹل میں میرا مذاق ہوگا" وہ میری بات سن کر پریشان سی ہو گئی "کیوں ایسی کیا بات ہے"؟ میں نے کہا "پھر بتاؤں گا" اور فوراً معافی کا خواستگار ہو کر ہوسٹل چلا آیا۔

---

اتوار کو گھر پر ملاقات ہوئی اور کھانے کے بعد وہ مجھ سے پوچھنے لگی "اس دن کیا بات تھی کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی"؟ میں نے اسے اپنے متعلق سب کچھ بتانا مناسب سمجھا "ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں تو نے اس دن مجھے مذاق سا بنا دیا تھا ارے پگلی میں تو یتیم ہوں ٹیوشن کے سہارے تعلیم حاصل کر رہا ہوں کمانے کے پیسے کہاں کا بنک؟ اور پھر ٹک شاپ تک تو نزدیک سے بھی گزرنا مشکل ہے"۔۔۔ وہ میری باتیں حیرت سے سنتی رہی اور پھر اشک آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا معافی مانگی میں نے کہا "شاید تو نے میری بات کا برا منایا ہے تب ہی معافی مانگ رہی ہے"۔ اس دن کے بعد اس میں ایک بڑی تبدیلی ہو گئی ۔۔۔ نہ کبھی ٹک شاپ کا ذکر نہ سیر و تفریح کا پھر میرے لئے کبھی قمیص کبھی بنیان کبھی موزے لاتی رہتی اور میرا دل اسے لاکھ لاکھ دعائیں دیتا۔

---

ایک دن میں نے مذاق میں پوچھا "تو کالج سے نکل کر کیا کام کرے گی" کہنے لگی "ڈاکٹری کروں گی" میں نے کہا "بہت اچھا کام ہے" کہنے لگی "اور تو"؟ میں نے کہا "وہی جواب کرتا ہوں پادری بنوں گا" وہ ہنسنے لگی "تیرا کام اچھا

رہے گا چندے ذرا کم مانگا کرنا۔" اس دن وہ اداس اداس سی تھی میں نے کئی بار پوچھا "کیا بات ہے آج کچھ چھپا رہی ہے۔" مگر وہ بدستور خاموش سی رہی۔ شام کو جب میں واپس آنے کے لئے اٹھا تو وہ خود بھی میرے ساتھ چل دی میں نے کہا "پگلی تو کہاں جائے گی آرام کر میں ابھی منٹوں میں پہونچ جاؤں گا۔" کہنے لگی ایک بات کرنی ہے۔" ہم چلتے رہے اور چپ چاپ کالج کے نزدیک والے باغ تک پہونچ گئے۔ میں نے پوچھا "ہاں کیا بات تھی وہ؟ دیکھ ہوسٹل بھی نزدیک آگیا۔" اس نے بنچ پر بیٹھتے ہوئے کہا "نسیم بھائی آج ایک صلاح لینی ہے مگر ذرا عقلمندی سے جواب دینا۔" میں نے کہا "ہاں پوچھ تو سہی" اس نے مجھے بتایا کہ اس کا ایک بھائی جو کیپٹن ہے کسی ملٹری افسر سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے دونوں بھائی لڑکا پسند کر چکے ہیں اس کی والدہ بھی راضی ہیں صرف اس کی رائے لینا باقی ہے وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے اور ایسا کرنے کے لئے ابھی چار پانچ سال تک اور پڑھنا پڑتا۔ کہنے لگی مجھے میرے خواب پورے ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔" میں نے پوچھا "لڑکا دیکھا ہے؟" اس نے بتایا۔

"تصویر آئی ہے۔"

پھر پسند آیا تجھے؟

"پسند ناپسند کا سوال ہی نہیں مجھے اپنے بھائیوں پر اعتبار ہے۔

بس تو پھر ٹھیک ہے اچھا ہے تو شادی کر ہی لے۔

وہ خاموش ہو گئی اور پھر شب بخیر کہہ کر ہم جدا ہو گئے۔

میں جن دنوں سمینری[1] میں الٰہیات کی تعلیم حاصل کر رہا تھا اس کا تار آیا لکھا تھا

---

[1] مدرسہ دینیات

"جلد آؤ" تیسرے دن میں وہاں پہونچ گیا۔ وہ اسٹیشن پر موجود تھی ملتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میں نے بمشکل اسے چپ کرایا۔ گھر پہونچے تو تمام بات کھلی۔ گزشتہ سال شادی کے بعد وہ اپنے خاوند کے ہمراہ چلی گئی تھی وہ بھی کیپٹن تھا چند ماہ اچھے گزرے مگر بعد میں معلوم ہوا وہ بے حد عیاش اور بدچلن ہے۔ بیچاری کہنے لگی کہ میں نے ہر طرح کوشش کی مگر حالات خراب ہوتے گئے دراصل شراب کی زیادتی نے ان کا مزاج خراب کر دیا تھا اور جب وہ زیادہ برداشت نہ کر سکی تو بغاوت پر آمادہ ہو گئی اور گھر چلی آئی۔ دونوں بھائی محاذ جنگ پر تھے کوئی بھی نہ آ سکا۔ پھر خبر ملی کہ اس کے خاوند نے ایک غیر ہندوستانی عورت سے تعلق پیدا کر لیا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے یہ بات وہ برداشت نہ کر سکی اور اب وہ اپنے خاوند سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا چاہتی ہے۔ سوائے طلاق کے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا اور اسی لئے مجھے بلایا گیا تھا۔

میں نے غور سے دیکھا دو برس پہلے وہ کچھ تھی اور اب نقاہت اور کمزوری سے کچھ اور ہو گئی مجھے وہ دن یاد آ گیا جب وہ شادی کے بعد اپنے خاوند کے ساتھ جا رہی تھی اس دن اس نے کہا تھا "نسیم بھائی اس پگلی بہن کو بھول مت جانا" اور اس دن وہ ہزاروں آنسوؤں سمیت رخصت ہو گئی تھی۔

طلاق کے بارے میں بات چیت کر کے میں واپس سمینری چلا گیا اور اپنی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔ چند ماہ بعد خبر آئی کہ اس کا خاوند حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے اچانک مر گیا۔ طلاق کا مقدمہ چل رہا تھا سو خارج ہو گیا پھر اس کی کوئی خبر نہ آئی کئی خط میں نے لکھے مگر جواب نہ آیا اور ناچار میں بھی خاموش ہو رہا۔ چار سال بعد جب میں سمینری سے نکلا تو میرا تقرر ایک شہر میں بطور پادری ہو گیا میری کلیسیا کے لوگ بہت اچھے تھے اور میں ان کی خدمت میں پوری جانفشانی سے مشغول ہو گیا۔

ایک دن صبح کے وقت مجھے اچانک اس کا خط ملا بہت لمبا چوڑا تھا پڑھا تو مسرت کے مارے لہرا اٹھا اگلے ہفتہ میں اسے ملنے گیا کانونٹ کی بڑی عمارت کے سامنے میں تانگے سے اترا۔ اور اندر داخل ہو گیا فادر سے ملا اور پھر مدر سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد وہ دس سال پہلے والی پگلی بہن مجھ سے چمٹی کھڑی تھی اس کی پیشانی پر نور برس رہا تھا اور وہ اس کونپل کی مانند تھی جو صبح سویرے سورج کی زریں کرنوں میں سب سے پہلے مسکرائی ہو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں نے کہا "تو نے اچھا حصہ چن لیا" خدا تجھے برکت دے۔

# طلب کی راہ میں

گھڑی نے الارم بجایا تو بابو جی گھبرا کر اٹھ بیٹھے کچھ دیر آنکھیں ملیں دو چار انگڑائیاں لیں اور پھر جمائیاں لیتے ہوئے بستر سے پاؤں نکالے اور نیچے لٹکا دیے پاؤں جوتوں کی تلاش میں تھے اور آنکھیں بیوی کے خالی بستر کی طرف دیکھ رہی تھیں جوتے پہن چکے تو باہر آنگن کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ چولھا گرم تھا پراٹھوں کی دلنواز خوشبو آنگن میں پھیل رہی تھی اور میم صاحبہ ابلے ہوئے آلو چھیل رہی تھیں۔ بچے بے خبر سو رہے تھے۔ بابو جی باہر آئے تو دبی دبی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میم صاحبہ کی طرف دیکھا اور بولے "تم کب اٹھیں؟ مجھے پتا بھی نہیں چلا" وہ بولیں "جانا تو تمہیں ہے اور فکر مجھے۔ سچ پوچھو تو نیند بھی بڑی مشکل سے آئی۔ یہی خیال آتا تھا تمہیں دیر نہ ہو جائے اور گاڑی کا وقت نکل جائے۔" بابو جی مصنوعی ہنسی ہنسے اور سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

شہر سے بڑے صاحب نے خط بھیجا تھا اور لکھا تھا اس بار پہلی تاریخ کو تمام منشیوں کو شہر آنا پڑے گا ایک ضروری میٹنگ ہو گی اور تنخواہ بھی وہیں ملے گی بابو جی کو میٹنگ کی کوئی خاص پرواہ نہیں تھی ہاں خیال تھا تو اپنی تنخواہ کا تھا اور یہی وجہ تھی کہ بچارے صبح سویرے بیدار ہوئے تاکہ گاڑی سے جلدی روانہ ہو سکیں اور دن نکلتے وقت ریلوے اسٹیشن پہنچ جائیں۔ گاؤں سے ریلوے اسٹیشن

تقریباً تین میل کے فاصلہ پر تھا اور تمام لوگ عموماً پیدل ہی آیا کرتے تھے۔

بابوجی واپس آئے تو کھانا تیار ہو چکا تھا انہوں نے غسل کیا کپڑے پہنے اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ میم صاحبہ نے ساتھ لے جانے کیلئے کھانا الگ باندھ دیا تاکہ بابوجی کو شہر جاکر ایسا ویسا کھانا نہ کھانا پڑے بچے ابھی سو رہے تھے اور دور شفق کی دھاریاں ابھی نمودار نہ ہوئی تھیں کسان کب کے کھیتوں میں جا چکے تھے اور پڑوس میں چکی چلنے کی آواز آرہی تھی گاؤں کے آوارہ کتے بھٹیوں میں منہ چھپائے سو رہے تھے اور چوکیداروں کی صدائیں کب کی بند ہو چکی تھیں میم صاحبہ نے باہر آنگن میں آکر آسمان کی طرف دیکھا اور بولیں "وقت کافی ہے تم اطمینان سے کھانا کھاؤ" بابوجی نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے فقط سر ہلا کر رہ گئے۔

جب گاؤں کا نمبردار اپنے بڑے بیٹے سمیت کنوئیں کے نزدیک والے غلیظ تالاب کے پاس سے گزر رہا تھا تو بابوجی گلی کے اگلے موڑ تک پہنچ چکے تھے کتے بالکل نہیں بھونکے اور کسی نے بابوجی کو جاتے نہیں دیکھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اور بھی تیز تیز چلنے لگے کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں اور گاڑی نکل جائے صاحب دل میں کیا سوچیں گے۔ پھر تنخواہ کا خیال آتے ہی وہ باہر جاتے ہوئے راستے پر تیزی سے مڑ گئے۔

---

گاؤں سے باہر نکلے تو کوڑے کرکٹ کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا بابوجی نے پیچھے مڑ کر دیکھا گاؤں ابھی تک خاموش ہلکی ہلکی سیاہی اوڑھے پڑا تھا کہیں کہیں دھواں آوارہ و پریشان پھر رہا تھا مگر چراغ سب بجھ چکے تھے ریت میں سے گزرتے ہوئے بابوجی کو اپنے صاف کپڑوں اور نئے جوتوں کا خیال آگیا وہ ذرا ہٹ کر ایک پگڈنڈی پر ہو لیے کوڑے کے ڈھیر خاموش پڑے تھے اور کہیں کہیں گھاس پھوس کے

نرم بستروں میں خارش زدہ کتے لمبے لمبے سانس لے رہے تھے، کوڑے کے ڈھیر دیکھ کر ان کو اپنا بچپن یاد آگیا۔ تین چار سال کا ایک نیم برہنہ لڑکا گندگی کے ڈھیروں کے نزدیک کھیلتا ہوا ان کے تحت الشعور سے ابھرا اور شعور میں رینگنے لگا۔ ایک بوڑھا باپ کنویں کی منڈیر سے دور شیشم کے درخت کی چھاؤں میں حقہ پیتا ہوا دکھائی دیا اور ایک بوڑھی ماں گوبر سے بھرا ہوا ٹوکرا اٹھائے جاتی دکھائی دی اس کے دونوں ہاتھ گوبر میں لت پت پسینے سے شرابور بدن، ہانپتی ہوئی بچاری کام میں مگن ہے۔ بڑا بھائی تھانیدار کے بیگار میں جاتا ہوا دکھائی دیا۔ شام کو مزدور اپنی مزدوری لیکر آتے اور وہ بچارا تھکے ہوئے بازو اور خالی جیب لے کر آتا۔ دو وقت کا کھانا ملتا مگر زندگی فقیروں سے بدتر خستہ حالی اور بے چارگی کا علاج کہاں ممکن تھا جوان بہن جس میں سارے گاؤں کا حسن مجسم تھا محض اس لئے ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی کہ جوان داماد کو جہیز میں دینے کے لئے ان خستہ حالوں کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

دن گزر رہے تھے اور زمینداروں کی حقارت آمیز گالیوں اور جاٹوں کے تندرست اور آوارہ لڑکوں کے تہذیب سے گرے ہوئے گندے مذاقوں کی خوراک پہ مفلسوں کی جوانیاں پنپ رہی تھیں۔ جب حقارت اور نفرت کے سائے تاریک سے تاریک تر ہونے لگے اور امیدوں کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے بجھنے لگے۔ ایک خدا کا بندہ مشعل لئے ہوئے گاؤں میں وارد ہوا۔ زمینداروں نے اس کی باتیں سنیں مگر ناک چڑھائی منہ بنایا اور کوئی توجہ نہ دی۔ جاٹوں نے اس کی آؤ بھگت کی مگر رفتہ رفتہ الگ ہو گئے ان کا طریق زندگی الگ اور اس مرد خدا کا راستہ جدا تھا وہ اس راہ پر آتے شرماتے تھے اور یہ اپنی راہ چھوڑ نہ سکتا تھا۔ جب گاؤں کے نیچ لوگوں میں اس کی مشعل کی روشنی پہونچی تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ ان درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں جہاں دیہاتی رومان پڑھے جاتے اور قصے گائے جاتے تھے اب لوگ مل جل کر بیٹھنے لگے

اور اس مردِ خدا کی باتوں پر توجہ دینے لگے حقوں کی گڑگڑاہٹ اور گوبر کی غلاظت یونہی قائم رہی مگر تاریک سایوں میں ہلکی ہلکی روشنی تھرکنے لگی امیدوں کے دیئے جلنے لگے اور زندگی اپنی تمام رعنائیوں سمیت پرورش پانے لگی ۔

بچوں کا اسکول کھلا بڑے گھرانوں کے لوگ نفرت کی وجہ سے بچوں کو نہ بھیجتے فائدہ اٹھایا تو خستہ حالوں اور مفلسوں نے جہاں اونچے گھرانوں کے بچے بیماری ہیضہ اور چیچک سے مرتے وہاں غریبوں کے بچوں کو مفت دوائی ملی اچھی تعلیم پاکر یہ گدڑیوں کے لعل چمکنے لگے پھر کلیسیا قائم ہوئی عبادت ہونے لگی اور لوگ ایک نئی زندگی کا خواب دیکھنے لگے ۔

پانچ سال بعد وہی غلیظ بچہ پہلی بار شہر کے ایک اسکول میں گیا اچھی تعلیم پائی اور رہنے سہنے کے اچھے اچھے طریقے سیکھے کپڑے پہننے کا ڈھنگ بھی آگیا اور پھر وہ دن بھی یاد آیا جب وہ آٹھویں پاس کرنے کے بعد مذہبی تعلیم کے لئے کچھ اور دور گیا واپس آیا تو گاؤں کا وہ غلاظت بھرا حصہ جہاں مفلسی اور فلاکت کے بھوت ننگے ناچا کرتے تھے ایک نئے اجالے میں نہایا ہوا نظر آیا ۔ گرجا بن چکا تھا اسکول قائم ہو چکا تھا گاؤں کے کئی نوجوان شہر میں کام کرتے تھے فوج میں نوکر تھے چھٹیوں میں سب آتے اور ایک نرالی زندگی تمام ماحول پر چھا جاتی ۔

وہ دن زندگی میں یادگار رہے گا جب گرمیوں کی ایک شام کو بابوجی اس نئے گرجے کے خادم مقرر ہوئے کاش وہ پرانے بوڑھے اس انقلاب کو دیکھ سکتے صاف اور اجلے کپڑوں میں ملبوس بابوجی پہلے آدمی تھے جو اسی گاؤں کی پیداوار تھے اور اب اس گاؤں کی خدمت پر مامور ہوئے ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے دل خوشی سے معمور تھے اور وہ جتنا بھی فخر کرتے کم تھا ۔

اور آج جب وہ اسی شہر میں تنخواہ لینے جا رہے تھے تو ان کا دل خوشی سے لبریز تھا

کوڑے کے ڈھیر دور ہو چکے تھے مگر بابوجی کو ان ڈھیروں کے نشیب و فراز میں اپنی زندگی کا لکھا ہوا تمام افسانہ نظر آتا تھا۔ انہوں نے مڑ کر پھر ان ڈھیروں کو دیکھا اور بے اختیار ہو کر بیگ میں سے انجیل کو نکال کر چوم لیا۔ اسی نور نے ان کو غلیظ ڈھیروں سے اٹھا کر اس بلندی تک پہونچایا تھا اور وہ خود اس نور کی روشنی میں بستر سے گرے ہوئے لوگوں کو اوپر اٹھانا چاہتے تھے۔ اسٹیشن نظر آنے لگا اور وہ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے گزر گئے ان کے ہونٹوں پر حمد و ستائش کے ترانے رقص کر رہے تھے۔

# بٹوارہ

ڈیوڈ اور ارشد دونوں ہم عمر تھے۔ دونوں ایک ہی جماعت میں زیر تعلیم تھے دونوں ایک ہی خاک سے اٹھے لیکن ان کے حالات میں ان کی طبائع میں اور انکے رجحانات میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ ارشد گاؤں کے ایک بہت بڑے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ تھا تو ڈیوڈ زمینداروں کے معمولی مزدور کا بیٹا۔

ارشد مسلمان تھا تو ڈیوڈ مسیحی، اس لئے اول الذکر موخر الذکر سے غایت درجہ نفرت رکھتا تھا وہ ڈیوڈ کو چھونا تو کجا اس کے پاس بیٹھنا بھی ناپسند کرتا تھا۔ یہ نفرت اور حقارت ایک پرتو اور عکس تھا ہندوؤں کی اس کراہیت کا جو وہ صدیوں سے دبائے ہوئے مظلوم لوگوں سے نسل بہ نسل کرتے چلے آئے تھے بلکہ مسلمان بھی باوجود شاہی اقتدار کے اس نفرت و حقارت سے نہ بچ سکے تو انہوں نے ردعمل یا تاثر کے طور پر اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں سے ویسی ہی نفرت کرنی شروع کر دی۔

وہ دونوں ہر روز رحیم پور سے سلیم آباد جو تین میل کے فاصلے پر واقع تھا دوسرے دیہاتی بچوں کے ہمراہ پڑھنے جایا کرتے تھے مقدمے بازی کے سلسلہ میں ان کے گاؤں میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ کئی مرتبہ جھگڑے ہوئے، لڑائیاں ہوئیں اور نوبت مقدمہ در مقدمہ تک پہنچ گئی۔ مقدمہ بازی زمینداروں کی سب سے بڑی کمزوری ہے

بعض لوگوں کے لئے یہ مئے دو آتشہ سے کم نہیں۔ وہ اس میں خاص کیف و سرور محسوس کرتے ہیں۔ بعضوں کو مجبوراً مقدمہ بازی کرنا پڑتی ہے۔ شرافت ہمارے یہاں ضعف بے بسی کے مترادف ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی اسکول کے بچوں میں بھی پارٹیاں بن گئیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اسکول کے بچے جھلس دینے وال دھوپ میں واپس آرہے تھے کہ راستہ میں ان کا جھگڑا ہوگیا۔ نوبت مار پیٹ تک پہنچ . . . . . . . . تقریباً پندرہ منٹ تک خوب کشتم کشتا ہوتی رہی۔ ڈیوڈ نے اپنے دل میں کہا یہ زمینداروں کے بچے ہیں، مجھے ان جھگڑوں سے کیا تعلق، لہٰ اس نے لڑائی سے کنارہ کشی اختیار کی، وہ ایک شیشم کے نیچے کھڑا ان کی لڑائی کا تما دیکھتا رہا۔ ارشد کی پارٹی راہ فرار اختیار کرنے کے قریب تھی، کیونکہ ارشد جو اس پارٹی کا لیڈر تھا بری طرح سے زخمی ہوگیا۔ ڈیوڈ اس پارٹی کی حمایت میں خم ٹھونک میدان میں آکھڑا ہوا۔ لڑائی کا پانسہ بدل گیا اور مخالف پارٹی دم دبا کر بھاگ نکلی ڈیوڈ نے ارشد کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا۔

اس دن کے بعد ارشد ڈیوڈ کا دوست بن گیا۔ اس کی ساری نفرت محبت بدل گئی، اس کا تعصب وسعت نظری میں تبدیل ہوگیا۔ فصل کٹائی کی چھٹیوں میں سب ہمجولیوں سے الگ تھلگ اپنے مویشی چراتے پھرتے۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں گاؤں کے نزدیک سے گزرنے والی سڑک پر گشت کرتے۔ کبڈی کھیلنے کے لئے ایک گروہ میں شامل ہوتے۔ اور موسم زمستاں کی طویل راتوں میں اکٹھے پڑھتے۔ میٹرک امتحانوں میں دونوں کامیاب ہوئے۔ ارشد کالج میں داخل ہوگیا۔ بی اے کیا بعد ازاں نائب تحصیلدار بن گیا۔ ڈیوڈ کالج میں داخل نہ ہوسکا۔ کیونکہ کلیسائی پادری کے باعث نہ اسے وظیفہ ملا نہ کسی علاقائی پادری نے اس کی کسی قسم کی حوصلہ

کی۔ وہ اپنے بوڑھے والد کے ساتھ زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنے پر مجبور تھا تاہم اپنی فرصت کے لمحات علمی و دینی کتب کے مطالعہ میں صرف کرتا تھا۔

ارشد جب کبھی گاؤں آتا تو ڈیوڈ کو اپنی حویلی پر بلاتا عہدِ طفلی کے تذکرے چھڑتے خوش گپیاں ہوتیں، کبھی کبھی علمی و مذہبی بحث شروع ہو جاتی۔ گاؤں کے زمیندار انکی آزادانہ باتیں سن کر حیران ہوتے، ان کی گہری دوستی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرتے۔ ایک دن گفتگو کے دوران ڈیوڈ نے ارشد سے پوچھا، مجھے ایک بات پر بہت حیرت ہوتی ہے۔ ارشد نے پوچھا وہ کیا۔

ڈیوڈ:۔ یہی..... کہ جب سلطان محمود اور محمد غوری وغیرہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان پر حملے کیے تو اس ملک کے بہت سے مظلوم اور ستم زدہ لوگوں نے جن سے از حد نفرت کی جاتی تھی، خوشی کا اظہار کیا بلکہ اپنے شہروں اور اپنے قصبوں اور اپنے گاؤں سے نکل کر میلوں ان کے استقبال کے لیے گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید یہ نئے آنے والے لوگ ہمارے دکھوں ہماری مصیبتوں اور ہماری مشکلات کو رفع کر کے ہم سے اچھا سلوک کریں لہذا انہوں نے بخوشی اسلام قبول کیا۔ یہاں کے سب مسلمان تو ایران و عرب سے نہیں آئے تھے۔ پھر مسیحیوں سے اتنی نفرت کی وجہ کیا۔

ارشد:۔ نہیں ڈیوڈ یہ بات نہیں۔ اسلام کے صوفیوں نے اس ملک کے باشندوں کے سامنے دو باتیں پیش کیں جو ہندو مذہب میں مفقود تھیں۔ بس وہی دو باتیں انہیں مرغوب و دلکش معلوم ہوئیں جن کے باعث بہت سے ہندوؤں نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا۔

ڈیوڈ:۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو ہندو دھرم میں مفقود تھیں۔

ارشد:۔ توحید اور مساوات۔

ڈیوڈ:۔ نہیں جناب..... اپنشدوں اور گیتا میں خدا کی بھگتی اور پریم کی تعلیم

پہلے سے موجود تھی۔ ویدوں اور اپنشدوں میں ایک ہی خدا کی تعلیم دی گئی ہے پریم سے مراد ہر ایک انسان سے محبت کرنا ہے۔ اس لئے اسلامی توحید اور مساوات ہندوؤں کیلئے جاذبیت کا باعث کیسے ہو گئی ؟

ارشد :۔ ڈیوڈ! کیا تم اس بت پرستی سے ناواقف ہو جو ہندوؤں میں متداول تھی۔ لہذا ہندو موحد کیسے تصور ہو سکتے ہیں۔

ڈیوڈ :۔ ہندو ایک ہی ایشور کو مانتے تھے۔ چونکہ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اس لئے دنیا کی مختلف اشیاء کو ایک ہی ایشور کے مظاہر سمجھتے ہوئے کائنات کی مختلف قوتوں اور خاصیتوں کو مختلف دیوتاؤں سے منسوب کرتے تھے ہند و علماء اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ لیکن عوام مختلف دیوی دیوتاؤں سے عقیدت رکھتے تھے۔ تاہم وہ مظاہر قدرت اور دیوی دیوتاؤں کے پردوں میں ایک ہی ایشور کو مانتے تھے۔ آخر حقیقت تک پہونچنے کے لئے مجاز ضروری ہے۔ ہندوؤں کے یہاں دیوی دیوتا مجاز تھے۔ جن کے ذریعے وہ حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتے تھے عوام مجاز میں ہی الجھ کر رہ جاتے ہیں اور خواص حقیقت تک جا پہونچتے ہیں۔ آخر اسلامی صوفیا بھی تو مجاز سے حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا اسلام نے ہندوؤں کے سامنے توحید کے متعلق کوئی نیا عقیدہ پیش نہیں کیا چونکہ ہندو مسئلہ وحدت الوجود کے مطابق ہر شئے میں ایک ہی حقیقت کو اعلیٰ فرق مراتب محدود سمجھتے ہیں اس لئے ہر شئے سے محبت کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ارشد کچھ دیر تک بحر تفکر میں غرق رہا پھر یوں گویا ہوا ۔ ڈیوڈ ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم سے انکار غیر ممکن ہے۔

ڈیوڈ :۔ آپ نے درست کہا لیکن ذات پات کی تمیز ہندوؤں کے سیاسی اور معاشرتی تقاضات کے مطابق معرض وجود میں آئی۔ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ منو سے

پہلے برہمن اپنے پست اخلاق کے باعث شودر ہو جاتا تھا اور شودر اعلیٰ اخلاق کے باعث برہمن بن جاتا تھا۔ منوسمرتی کی تصنیف کے بعد یہ آزادی نہ رہی تاہم بہت سے ہندو شاعر، ہندو فلاسفر، ہندو یوگی اور عالم تپسیا کے طور پر شودروں میں رہائش اختیار کر لیتے تھے۔ گاندھی کی اچھوت تحریک کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ طوائف الملوکی کے زمانہ میں بہت سے عالی نسب خاندان شودروں کے ہاں پناہ گزیں ہوتے تھے پھر انہیں میں گھل مل جاتے تھے لہٰذا ان ہماری بستیوں میں جو لوگ آباد ہیں وہ سب ہی حقیر اور قابل نفرت خاندانوں میں سے نہیں ان غریبوں کی رگوں میں بھی اعلیٰ لوگوں کا خون جاری وساری ہے۔

ارشد:۔ ڈیوڈ تاریخ کی روشنی میں تم نے درست کہا واقعی ہندوستان پر اسلامی حملوں کے وقت تمہاری بستیوں کے بہت لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے جنہوں نے بعد میں دھوبی۔ نجار۔ لوہار اور سقہ کے پیشے اختیار کیے لیکن شاہی سرپرستی اور اسلامی اقتدار کے باعث ان لوگوں میں احساس کمتری نہ رہا۔ لیکن جو مسیحیوں سے نفرت کرتے ہیں وہ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی کرتے ہیں۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ ایک مسلمان ایسے کفر اور شرک کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ لہٰذا کفر و شرک سے نفرت کے باعث وہ مسیحیوں سے نفرت کرتا ہے۔

ڈیوڈ:۔ اب رات بہت گزر گئی ہے۔ میں غنودگی محسوس کرتا ہوں۔ آپ کی اس بات کی تردید کل رات کو کروں گا۔ اب اجازت دیجیے۔

ارشد:۔ ڈیوڈ۔ ! مجھے مذہب کے متعلق کوئی واقفیت نہیں۔ اگر اجازت ہو اس موضوع کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے کے خیال سے گاؤں کے مولوی صاحب کو دعوت دے دوں۔

ڈیوڈ:۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

دوسرے دن رات کے آٹھ بجے مختصر سی محفل منعقد ہوئی۔ پہلے ارشد نے چائے اور شیرینی سے خاطر تواضع کی گاؤں کے مولوی شیر علی نے سلسلۂ گفتگو یوں شروع کیا۔

شیر علی:۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسیحیت اسلام کے بہت قریب ہے۔ لیکن قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہے۔

ڈیوڈ:۔ ذرا اسکی وضاحت فرمائیں۔

شیر علی:۔ ہمارا ایمان ہے اللہ کے نزدیک مذہب اسلام ہی ایک مذہب ہے وہ واحد ہے۔ اس لئے اس کا دین بھی ایک ہی ہے۔ تمام انبیا شروع سے اسلام کی تعلیم ہی پیش کرتے رہے ہیں لیکن فرق یہاں آکر پڑا۔ کہ مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ قرآن شریف میں مذکور ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں۔ کیونکہ اس کی کوئی بیوی نہیں۔

ڈیوڈ:۔ اس آیت قرآنی سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مسیح کے بہ حیثیت جسم و جسمانی خدا کا بیٹا ہونے کی تردید کرتا ہے۔ ہم بھی کہتے ہیں، مسیح بہ حیثیت جسم و جسمانی خدا کا بیٹا نہیں لیکن وہ کلمۃ اللہ، روح اللہ ہونے کے باعث خدا کا بیٹا ضرور ہے۔ کلمہ وجود سے صادر ہوتا ہے میرا کلمہ و کلام بھی میرے وجود سے صادر ہوا ہے۔ امام غزالی جیسے علماء نے خیالات اور علم و کلام کو اولاد باطنی تسلیم کیا ہے۔ خدا ازل سے موجود ہے ازل میں ہی اسکے وجود سے علم و کلام یا شعور صادر ہوا۔ شرح مواقف میں مرقوم ہے ذات تعالےٰ کے وجود کے لئے شعور لازم ہے حضرت مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ ذات حق کی تجلی کے بعد تجلی علمی ہے دیگر صوفیائے کرام بھی مانتے ہیں کہ ذات حق کا ظہور بمقام احدیت سے وحدت میں جو علم کلام کے مترادف ہے ہوا ہے ہم کلام و علم کو جو مسیح ہے وجود حق سے صادر ہونے کے باعث بیٹا کہتے ہیں۔ چینی لوگ اپنے بادشاہ کو فغفور کہتے تھے جس کے معنی ہیں خدا کا بیٹا ہندو پراجاپتی یعنی خدا کے برہمن یعنی کلام کو لڑکی کہتے تھے قدمائے یونان نیک خدا رسیدہ انسان کو خدا کا بیٹا کہتے روم کے رواقی فلاسفر سورج کو خدا کا بیٹا تصور کرتے تھے سکندریہ کے یہودی فلاسفر فائیلو نے

خدا کے علم وکلام کو خدا کا بیٹا کہا ہے۔ انہی معنوں میں مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

شیر علی۔ لیکن لفظ بیٹا خدا کے جسم وجسمانی ہونے پر دال ہے

ڈیوڈ:۔ اگر کسی شخص کو اسکی زمانہ سازی کے باعث ابن الوقت کہہ دیا جائے تو کیا وہ جسمانی طور پر وقت کا بیٹا ہوگا۔ ہرگز نہیں یا اگر آنحضرت کے ایک صحابی کو ابو ہریرہ کہتے تھے تو کیا وہ جسم وجسمانیت کے اعتبار سے بلی کے باپ تھے بالکل نہیں۔ یا اگر قرآن کریم میں مسافر کو ابن السبیل کہا گیا تو کیا اس سے یہ مراد ہے کہ وہ راستہ سے پیدا ہوا قطعاً نہیں یہ تمام استعارے ہیں جو گہرے تعلق اور گہرے رشتہ پر دلالت کرتے ہیں اسی طرح مسیح چونکہ ذات حق سے بے مثال گہرا تعلق ورشتہ رکھتا ہے اس لئے اسے استعارۃً خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔

شیر علی:۔ سورہ احد میں مذکور ہے قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد۔

ترجمہ۔ کہدے اللہ تعالے تو ایک ہے وہ بے نیاز ہے وہ نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا کیا گیا اس کا کوئی ثانی نہیں یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں ابنیت مسیح کے مسئلہ کو باطل کر دیا۔

ڈیوڈ:۔ نہیں جناب! قرآن کریم کا روئے سخن عرب کے بت پرستوں کی طرف ہے جو لات منات اور عزیٰ کو خدا کی بیٹیاں تصور کرتے تھے پھر بعض عرب فرشتوں کو خدا کے بیٹے کہتے تھے اسی تصور ابنیت کے ابطال کے سبب قرآن حکیم میں مسیح کو کلمۃ اللہ تو کہا گیا لیکن ابن اللہ کی اصطلاح کو نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ کلمۃ اللہ ابن اللہ کا مفہوم ایک ہی ہے از روئے فلسفہ کلمۃ اللہ اور ابن اللہ لازم وملزوم ہے۔

شیر علی:۔ ہم تو قرآن کریم کے مقابلہ میں فلسفیانہ نظریات کو غلط وبے سود سمجھتے ہیں۔

ڈیوڈ:۔ معلوم ہوا آپ فلسفہ وسائنس میں الہام ومکاشفہ کی تجلی کو تسلیم نہیں کرتے

شیر علی:۔ بالکل نہیں۔

ڈیوڈ:۔ شاید آپ فلسفہ کا مفہوم نہیں سمجھے۔ آخر قرآن کریم بھی تو اللہ تعالےٰ کی ذات اور اس کی وحدت کے متعلق دلائل پیش کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم میں بھی فلسفیانہ انداز موجود ہے۔ اس لئے آپ الہام و فلسفہ میں اتنا تفاوت و تباین کیوں سمجھتے ہیں؟ اگر خدا کے الہام و مکاشفہ میں فلسفہ ہے تو فلسفہ میں کسی حد تک الہام و مکاشفہ کیسے موجود نہیں ہو سکتا؟

ارشد:۔ ابنیت مسیح کے متعلق کوئی دلیل پیش کرو۔

ڈیوڈ:۔ حق تعالےٰ کی تمام صفات ازلی ہیں ہم انہیں صفات حقیقیہ اور اضافیہ میں منقسم نہیں سمجھتے۔ کس لئے کہ اس کی ذات اعلیٰ و برتر ہے۔ اسے کسی شے سے اضافت و نسبت نہیں۔ بعینہٖ اس کی صفات کو کسی چیز سے اضافت و نسبت نہیں ہو سکتی۔ حق تعالیٰ کی صفات ازلیہ حقیقیہ میں خالقیت بھی ایک صفت ہے جو ازلی ہے اس کی ذات میں قوت تخلیق ازلی سے ہے۔ یہ قوت جمود و سکوت کی حالت میں نہ رہی۔۔۔۔ کس لئے کہ حق تعالےٰ کسی حالت میں منتظر کا محتاج نہیں لہٰذا ایک مخلوق ازلی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ واحد سے واحد شے ہی صادر ہو سکتی ہے۔ یہ مخلوق ازلی بیٹا ہے جسے ہم مسیح کہتے ہیں۔ قوت تخلیق حق تعالےٰ سے پھوٹ نکلی جیسے کہ آفتاب سے روشنی پھوٹ نکلتی ہے۔ تخلیق ازلی تخلیق حادثی کی مانند جسم و جسمانی نہیں بلکہ نور سے نور اور الوہیت سے الوہیت پھوٹ نکلی۔ سرچشمہ الوہیت کو باپ اور جو الوہیت پھوٹ نکلی اسے ازلی بیٹا کہتے ہیں۔

شیر علی:۔ احباب محترم۔ اس علمی، فلسفیانہ مذاکرہ سے بہت حظ حاصل ہوا۔ ہم نے پہلے اس قسم کی باتیں کبھی نہیں سنیں۔ نہ ہر ایک مسیحی ایسے دلائل دے سکتا ہے۔ بہتر ہے اب ہم اس محفل کو برخاست کریں۔

مولوی صاحب تو اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن ارشد و ڈیوڈ کے درمیان ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے ڈیوڈ نے ارشد کو کہا کہ اگر طبیعت پر ناگوار نہ گزرے تو کل

شام کو آپ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمائیں ارشد نے اس دعوت کو بخوشی قبول کر لیا۔

ڈیوڈ نے اپنی بہن بلقیس کو جو میٹرک کا امتحان دے کر اب گھر میں ہی رہتی تھی، چائے کا اہتمام کرنے کو کہا ارشد، ڈیوڈ اور بلقیس چائے کے بعد کافی عرصہ تک محو گفتگو رہے۔ ارشد نے ڈیوڈ کو مشورہ دیا کہ بلقیس گھر میں بے کار رہنے کی بجائے کسی گاؤں کے اسکول میں استانی لگ جائے تو بہتر ہو گا۔

ڈیوڈ نے کہا کہ آج کل سفارش کے بغیر کام ملنا مشکل ہے۔ ارشد نے وعدہ کیا کہ بلقیس کو کام دلوانے کی حتی الوسع کوشش کرے گا

ارشد کی شادی اس کے اپنے ہی خاندان کی ان پڑھ لڑکی سے ہو گئی تھی۔ اب وہ ماشاءاللہ ایک بیٹے کا باپ بھی تھا۔ شادی ہونے کو تو ہو گئی، لیکن پرانے خاندانی تنازعات کے باعث میاں بیوی میں جھگڑا رہتا تھا۔ ارشد کی بیوی زاہدہ تند مزاج اور غصیل تھی اسکی نند طاہرہ جب گھر آتی تو اس کا ناک میں دم کر دیتی۔ طاہرہ رحمت آباد میں جو رحیم پور سے پندرہ کوس کے فاصلے پر تھا...... پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ ارشد اور طاہرہ نے یہ بات طے کی کہ گرمیوں کی تعطیلات کے بعد بلقیس کو بھی رحمت آباد کے اسکول میں لگوایا جائے

بلقیس کی حصول ملازمت سے متعلق درخواست منظور ہو گئی۔ والدین اور بہن بھائی بہت خوش تھے کہ بارے خدا خدا کر کے خاندان کے کسی فرد کو ملازمت تو ملی۔ والدہ اپنی بچی کو بنفس نفیس رحمت آباد چھوڑنے گئی لیکن کسی نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک نوجوان لڑکی دوسرے گاؤں میں اکیلی کس طرح رہے گی اس کی خوراک کا انتظام کیا ہو گا اور اسکے پاس کون رہے گا۔

طاہرہ بلقیس سے نہایت حسن سلوک سے پیش آئی اس نے اسے اپنے پاس ٹھہرا لیا طاہرہ اپنی وحشت زدہ زندگی سے اکتا گئی تھی اب اسے سکون اور ایک طمانیت سی محسوس ہونے لگی۔ دونوں شام کے کھانے کے بعد جی بھر کے باتیں کرتیں۔ بلقیس اس

نئے ماحول میں بہت مسرور و شادماں تھی۔ ایک ماہ کے بعد ارشد طاہرہ سے ملنے کیلئے آیا۔ وہ طاہرہ اور بلقیس کے درمیان خوشگوار تعلقات دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کاش زاہدہ اور طاہرہ میں بھی ایسی ہی محبت ہوتی۔ ارشد نے زیر لب کہا۔ جس طرح رات کی تاریکیوں میں بزم انجم جگمگاتی ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کی رات کے سایوں میں بلقیس کی محبت کا چاند جگمگا اٹھا۔ صبح روانہ ہوتے وقت اس نے خلوت میں بلقیس کے حسن و جمال کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ بلقیس شرمائی اور ایک انداز محبوبانہ کے ساتھ دوسرے کمرہ میں طاہرہ کے پاس چلی گئی۔ اب اسکے دل میں ایک خلش ایک تڑپ اور ایک بیقراری تھی وہ ارشد کے دوبارہ آنے کے یوم موعودہ کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ ایک شام طاہرہ اور بلقیس کھانا تناول کرنے کے بعد اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھی محو گفتگو تھیں باتوں کے دوران طاہرہ نے موقعہ پاکر بلقیس کو کہا کہ وہ اس میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھتی ہے اگر اسے ارشد سے محبت ہو تو اسے شادی کر لینا چاہئے۔ یہ سن کر بلقیس گہری سوچ میں کھو گئی، پھر کچھ وقفہ بعد مہر سکوت توڑتے ہوئے کہنے لگی۔

یہ کیسے ممکن ہے، میرے والدین کیا کہیں گے۔ ارشد کے والدین یہ کیسے گوارا کریں گے کہ انکے اکلوتے بیٹے کی شادی ایک مسیحی لڑکی سے ہو جائے؟ طاہرہ نے کہا والدین، برادری اور گاؤں کے لوگ زیادہ سے زیادہ ایک دو ہفتہ تک اس امر کا چرچا کریں گے پھر کوئی اسکا نام بھی نہ لیگا۔ تم ایک اعلیٰ خاندان میں چلی جاؤگی ارشد گاؤں کا بہت بڑا زمیندار ہے۔ پھر خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ پھر طاہرہ نے مسیحیت پر طرح طرح کے اعتراضات کئے جن کا جواب بلقیس نہ دے سکی۔ اسکے دل میں بھی مذہب کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہوئے۔ وہ کئی دنوں تک سوچتی رہی کہ خدا انسان کیسے بن گیا؟ مسیح خدا کا بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے لامحدود شخصیت محدود کس طرح ہو سکتی ہے۔

پھر ایک دن طاہرہ نے بلقیس کے ایک ایک عضو کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے کسی طور طریقے سے بھی مسلم نہیں ہوتی۔ نہ اس نے کبھی صبح غسل کے بعد تلاوت انجیل کی ہے بلکہ اسکے پاس

انجیل سرے سے پڑھی ہی نہیں۔ نہ اس نے کبھی خلوت میں جا کر دعا کی ہے نہ اسے مذہب کی کوئی واقفیت ہے وہ تثلیث فی التوحید اور الوہیت مسیح ایسے فلسفیانہ مسائل کو سمجھنے سے قاصر ہے مسیحی عقائد کے مقابلہ میں اصولات اسلامی اتنے سادہ اتنے آسان اور فطرت انسانی کے مطابق ہیں کہ نادان سے نادان اور جاہل سے جاہل انسان بھی انہیں بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مسیحیت کا راستہ بہت تنگ اور اسلام کی راہ بہت کشادہ ہے وہ شکل صورت سے مسیحی معلوم نہیں ہوتی ایسی پیاری شکل اسلام کو ہی زیبا ہے بہتر ہے تم اسلام قبول کر لو۔ ارشد سے بہتر رشتہ تمہیں کہیں نہ ملے گا۔ دیکھو اب اسلامی حکومت ہے مسلمان علم و ہنر میں اور ثروت و امارت میں حیرت انگیز ترقی کر رہے ہیں۔ اسکے برعکس مسیحی لوگ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بہت پست ہیں ایک مشن اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے اسے بتایا تھا کہ مسیحی لڑکے فاقہ مست ہیں اپنے مستقبل سے بے نیاز ہیں وہ نہ پڑھنے میں دلچسپی لیتے ہیں اور نہ کوئی ہنر سیکھنا چاہتے ہیں پاکستانی کلیسائیں بربادی کی راہوں پر گامزن ہیں مسیحیوں میں کوئی احساس قومیت نہیں، وہ اس مسافر کی مانند ہیں جو شب تاریک میں جادہ پیما ہو اسکے سامنے کوئی منزل اور کوئی مقصد نہ ہو۔ نہ اسکے دل میں دختر سحر کے عارض تاباں دیکھنے کی تمنا ہو۔

بلقیس کو طاہرہ کی تمام باتیں صحیح اور درست معلوم ہوئیں اسے ان میں حقیقت کی جھلک نظر آئی۔ خود اسکے گاؤں کے مسیحی دو پارٹیوں میں منقسم تھے۔ سوائے اسکے بھائی کے کسی مسیحی لڑکے نے تعلیم حاصل نہیں کی، لیکن وہ بھی پارٹی بازی کی لعنت کے باعث اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکا تھا یہ حقیقت اس پر واضح ہو گئی کہ مسیحی رہنے کی صورت میں اسے اچھا شوہر نہ مل سکے گا۔

ارشد کی ملاقاتوں نے اسکی محبت میں گہرائی، خلش اور تڑپ پیدا کر دی۔ اس کے لئے لمحہ بھر کیلئے جدا ہونا دوبھر ہو گیا۔ بلقیس اعتراف محبت کرتے ہوئے ارشد کیلئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ جام محبت سے سرشار ہو کر وہ بہکتی بہکتی دور نکل گئی اور ایک دن اس نے ارشد کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے اسلام قبول کر لینے کا وعدہ کیا۔ رحمت آباد کے مولوی محمد علی کے ہاتھوں بلقیس نے نماز جمعہ کے بعد اسلام قبول کر لیا مولوی صاحب نے مبارکباد دینے کے بعد اسے کہا۔

اچھا ہوا تم ایک بےحس اقلیت کو چھوڑ کر ایک زندہ قوم میں شامل ہو گئیں۔ مسیحیوں میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ جب تک اس اقلیت کا ایک ایک فرد ہر شعبہ حیات میں دلچسپی لیتا ہوا محنت و جانفشانی نہ کرے اس اقلیت کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا کہ اس نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ جب تک خود اسے اپنی حالت کے بدلنے کا خیال نہ ہو۔ اب تم ایک بہتر دین میں داخل ہو گئی ہو۔ اس میں استوار رہنا۔

مولوی صاحب نے بڑے فخر سے بلقیس کے قبول اسلام کی خبر اخبار میں شائع کرا دی۔

چند دنوں کے بعد بلقیس کا ارشد کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ یہ خبر ہمارے علاقے میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ زاہدہ کے والدین کو ارشد کے نکاح ثانی کی خبر ہوئی تو بہت متاسف و متفکر ہوئے۔ اسکے پاس آ کر لعنت ملامت کی کہ اس نے ایک ادنیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی۔ ہمارے رشتہ داروں کی ناک کٹوا دی۔ اتنی بڑی جائیداد اب کئی حصوں میں منقسم ہو جائیگی۔ ڈیڈ نے کچھ دن ناراضگی کا اظہار کیا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ارشد و بلقیس کے ہاں آنا جانا شروع کر دیا۔

زاہدہ کے والدین ارشد کو بلقیس سے متنفر نہ کر سکے بلکہ وہ رحیم پور کی بجائے رحمت آباد زیادہ آنے جانے لگا اس نے نئی منکوحہ سے زیادہ محبت کا اظہار کیا۔ زاہدہ نے یہ سب کچھ دیکھا اور خاموش رہی۔ آٹھ ماہ بعد وہ رحمت آباد میں بلقیس کے پاس آ کر کہنے لگی کہ اسے اسکی ہر بات منظور ہے۔ وہ اسکے پاس رہے گی۔

تابستان کی ایک شام چودھویں کا چاند نیلگوں رفعتوں سے ضیا باریاں کر رہا تھا۔ بلقیس اکیلی گھر کی چھت پر چارپائی پر لیٹی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اسے کھانے میں زہر دے دیا گیا۔ وہ شدت درد سے بیتاب تھی اسے بار بار پیاس لگتی تھی اس کے قریب رکھی ہوئی ٹھلیا کا پانی ختم ہو گیا۔ کوئی اسے پانی دینے والا نہ تھا۔ کاش اسوقت ڈیڈ میرے پاس چلا آئے۔ آہ! میں نے اپنی خواہشات پہ مسیح کو قربان نہ کر دیا ہوتا اس نے زیر لب یہ جملے کہے۔

دوسرے کوٹھے پر زاہدہ ارشد کو کہہ رہی تھی۔

دیکھا میں نے تمہاری زمین۔ تمہارے باغ تمہارے تمام اثاثہ کو بٹوارے کے تمام امکانات سے بچا لیا۔ تمہاری تمام جائیداد میرے امجد کی ہے اور اسی کو ملے گی۔

# جنازے کی بارات

رات کی تاریکی آہستہ آہستہ بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے سینا ٹوریم کو اپنے سیاہ خوفناک پیروں تلے دبوچ کر بیٹھ گئی۔ بجلی کی زرد روشنی میں مریضوں کے چہرے اور بھی زرد نظر آنے لگے ساری عمارت پر جیسے موت کی گہری خاموشی چھا گئی۔ کھوکھلی چھاتیوں سے ابھرتی ہوئی کھانسیوں اور ڈیٹول کی تیز بو سے سارا وارڈ کراہ اٹھا۔

جمنا وارڈ میں بیس پلنگ تھے اور بیسیوں پر جلتے سلگتے جسم پڑے تھے۔ ان میں کچھ بوڑھی عورتیں بھی تھیں جن کی زندگیوں میں نہ جانے کتنے سرد و گرم دور آئے۔ نہ جانے کتنے اتار چڑھاؤ آئے اور آج جب ان کے دل میں زندگی کی کوئی امنگ باقی نہ رہی تھی تو وہ سکون کی موت مرجانے سینا ٹوریم کی چار دیواری میں جیتی جاگتی لاشیں بن کر آگئی تھیں۔ ان میں کچھ شادی شدہ نوشگفتہ پھول بھی تھے تو کچھ ادھ کھلی کچی کنواری کلیاں بھی تھیں۔ بھانت بھانت کے پھول بھانت بھانت کی کلیاں ..... مرجھائی جھلسائی پنکھڑیوں والے جنہیں نہ تو اب خوشنما ہار بنا کر کسی کے گلے میں ڈالا جا سکتا تھا نہ ہی مسکراتے ہوئے کسی کوٹ کے کالر پر سجایا جا سکتا تھا۔ کچھ ننھی سی پیاری کونپلیں بھی تھیں۔ شبنم کے

موتیوں کی طرح شیتل۔ کنول کے پھول کی مانند کومل جن کے سدا بہار مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے دق کے جراثیم اندر گھسے تو ان کی چھوٹی چھوٹی چھاتیوں پر قبضہ جما کر بیٹھ گئے۔ سفید سفید بستروں پر لیٹے ہوئے ان کے اجلے اجلے چہرے اس وقت ایسے لگ رہے تھے جیسے دور آسمانوں سے فرشتے اتر آئے ہوں اور وارڈ کے پلنگوں پر زبردستی لیٹ گئے ہوں۔

مونا نے کھانستے ہوئے کروٹ بدلی تو لوہے کا پلنگ بھی چیخ اٹھا۔ پچھلے ایک ہفتہ سے مسلسل اسے بخار آ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے بجلی کا تار چھو لیا ہو اور اس کے انگ انگ میں بجلی سنسنا رہی ہو۔ اس کی ہڈیاں تڑخ رہی ہوں ..... چہرے پر سے پسینے کے قطرے پونچھنے کے لئے جب اس نے تولیہ اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی ساری طاقت سلب ہو چکی ہے اور وہ تولیہ نہیں بلکہ نو من کی پوٹ اٹھا رہی ہے۔

کل شام جب اچانک اس کی چھاتی میں سخت درد اٹھا اور خون قے کے ساتھ چلمچی میں ابل پڑا تو اسے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کی جنگ میں پسپا ہوتے ہوئے وہ بہت دور تک پیچھے چلی آئی ہے اور زخموں سے چور چور ہو کر گرنے ہی والی ہے ..... آج باوجود ہزار کوششوں کے اسے نیند نہیں آ رہی تھی اس کے بستر کی سلوٹیں جیسے انگنت سانپ بن کر اس کے جسم کے نیچے سرسرا رہی تھیں مونا نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں اٹھائیں اور چھت کے قریب نیم وا روشندان میں گاڑ دیں۔

پچھلے دو سال سے وہ ایسا ہی کر رہی تھی جب بھی وہ ماضی کے خوشنما تصورات میں کھو جانا چاہتی تو دھیمے سے اپنی نظریں اٹھاتی اور روشن دان میں گاڑ دیتی اور پھر اس کا ماضی فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا اور آج پھر جب اس نے اپنی نظریں روشن دان میں پیوست کیں تو اس کے ماضی کا حسین عہد اس کے

ذہن میں رقص کرنے لگا۔

وہ دلہن بنی اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی سہیلیاں ڈھولک پر گا رہی تھیں۔

بن ٹھن کے دلہن چلی پی کے نگر
مورا میکے میں جی گھبراوت ہے

پھر دفعتاً سہیلیاں ڈھولک تاشے چھوڑ کر بھاگیں اور چھت کی منڈیروں پر جھول گئیں دور بینڈ باجے بج رہے تھے اور بارات آ رہی تھی اس کا من خوشی سے ناچ اٹھا تھا کیونکہ اس نے پہلے ہی راج سے کہہ دیا تھا "دیکھو جی بارات میں شہر کا سب سے اچھا بینڈ لانا اور مجھے گاجے باجے کے ساتھ لے جانا۔"

پھر جب وہ پھولوں سے لدی ہوئی بیٹھی تھی تو راج نے دھیمے سے اسکی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "رانی آج سے تم میری زندگی ہو۔ میری روح ہو میری شریک حیات ہو۔" اور تب ہی سے وہ اسے رانی کہنے لگا۔

وقت اڑتا رہا۔ دن گزرتے رہے اور پانچ سال بعد منّا جب ایک ننھے سے کیڑے کی شکل میں اس کی گود میں گھسا تو دق کے جراثیم بھی اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو گئے۔ دونوں کیڑے اپنی اپنی جگہ پھیلتے بڑھتے رہے۔ جب منّا پیدا ہوا تو وہ بہت کمزور ہو چکی تھی۔ مگر راج نے اس کمزوری کو زچگی کی کمزوری سمجھ کر کوئی خاص توجہ نہ دی اور وہ خود بھی منّے کی خوشی میں اپنے سارے دکھ درد بھول گئی۔

وقت گزرتا رہا دن بدلتے رہے۔ منّا دو سال کا ہو چکا تھا اور رانی کو ہلکا پھلکا بخار رہنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کو بتایا گیا۔ چھاتی کا ایکسرے لیا گیا..... پھر ایک دن راج نے اسے کہا "رانی کچھ دنوں کے لئے ہسپتال میں رہ لو تو ٹھیک ہو جاؤ گی۔" تب اسے معلوم ہوا کہ اسے دق ہو گئی ہے دوسرے درجے کی دق۔

یکبارگی مونا کو پھر کھانسی کا دورہ اٹھا اسے یوں لگا جیسے اس کے سینہ پر کسی نے چٹان کی چٹان اٹھا کر رکھ دی ہو وہ تلملا اٹھی۔ نظریں روشندان سے ہٹ کر نیچے پڑی ہوئی چلمچی میں گڑ گئیں۔ گاڑھا گاڑھا قتلے دار جما ہوا سیندوری رنگ کا خون اس کے منہ سے چلمچی میں گر رہا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ دوسرے دن شام کے چار بجے راج پھلوں سے بھری تھیلی ہاتھ میں لے کر اس سے ملنے آیا تو وہ بال سنوار رہی تھی۔ راج کو دیکھتے ہی سنبھلی۔ پلّو درست کیا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی آج وہ معمول سے زیادہ خاموش تھی۔ بجھی بجھی۔ کھوئی کھوئی — راج نے اچٹتی نظر سے چارٹ کی طرف دیکھا اسے بخار تھا ۱۰۱ ڈگری۔

ارے رانی تمہیں پھر بخار چڑھ آیا

مونا مسکرا کر رہ گئی۔

---

دھیمے سے اس نے نظریں اٹھائیں اور پھر روشندان میں گاڑ دیں جہاں دو کبوتر ایک نر ایک مادہ بیٹھے بیٹھے غٹرغوں کر رہے تھے۔ اس کا تصور پھر ہچکولے لینے لگا روشندان جیسے اس کا گھر بن گیا ہو۔

وہی کمرہ وہی برآمدہ۔ وہی چوکا..... وہی چوکے کے اوپر طاقیں جن میں مرچ مسالوں اور دالوں کے قرینے سے رکھے ہوئے ڈبے وہی نہانے دھونے کی چوکڑی اوپر تنی ہوئی الگنی جس میں ہمیشہ کی طرح جھولتے ہوئے اس کے ساڑھی اور بلاؤز۔ مگر منا کہاں ہے..... باہر صحن میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہوگا غٹرغوں غٹرغوں..... جیسے راج اور وہ دونوں کمرے میں ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ہوں اور راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہوں اور وہ کبوتری کی طرح شرما لجا رہی ہو — گھر کی ایک ایک شے ایک ایک کونا اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ خیالوں ہی خیالوں میں اس نے

دالوں اور مسالوں کا ایک ڈبہ کھولا اور دیکھا کہ کس میں کتنی چیز باقی رہ گئی ہے۔ پھر جیسے یکایک اسے دو سال پہلے کی بھولی ہوئی کوئی چیز یاد آگئی۔

"راج —" اس نے دھیمے سے کہا۔

"کیا ہے رانی۔" راج نے آہستہ سے کہا۔

"دیکھو الگنی پر میں نے اپنی کالی ساڑھی سکھانے کے لئے ڈالی تھی کیا تم نے اٹھا کر صندوق میں رکھ لی ہے؟

"ہوں —"

"اور دیکھو وہ پہلی طاق کے کونے میں جو ہرے رنگ کا ڈبہ ہے نا۔ اسمیں میں نے مونگ کی دال کی بڑیاں بنا کر رکھی تھیں تم اسے کھاتے تو ہو نا؟"

"ہوں —"

راج کی نگاہیں اس وقت سونا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"راج۔"

"ہاں۔"

"تم یہاں جب آرہے تھے تو منا کیا کر رہا تھا؟ میرے لئے پوچھ رہا تھا؟"

"منے کو میں پڑوس میں چھوڑ آیا ہوں۔ بڑی ضد کر رہا تھا۔ "ہم بھی ممی کے پاس چلیں گے۔ آپ تو روج جاتے ہیں ہمیں نہیں لے جاتے۔""

"تو تم نے اسے کیسے پھسلایا" — سونا کی بے نور آنکھیں اس وقت روشندان میں گڑی ہوئی تھیں جہاں وہ اپنے ننھے منے کو گود میں لئے بیٹھی آہستہ آہستہ اسکے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوار رہی تھی۔

منے کو کیسے پھسلایا۔ راج سوچ میں پڑ گیا۔ "رانی میں نے اسے کہا بیٹا تیری ماں اس وقت بہت دور رہتی ہے۔ راستے میں ایک ندی پڑتی ہے جسے چھوٹے

بچے پار نہیں کر سکتے بیٹا میں بہت جلد تمہاری ماں کو گھر لانے والا ہوں تھوڑے ہی دنوں میں وہ بالکل اچھی ہو جائے گی۔"

دفعتاً سونا کو کھانسی کا سخت دورہ پڑا۔ اس کے چھاتی کا سیلاب گڑگڑا اٹھا تڑپ کر اس نے اپنا منہ چلمچی میں ڈال دیا تو راج کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خون اس کے ارمانوں کا خون۔ رانی کے حسین خابوں کا خون!!

راج نے فوراً رانی کو سہارا دیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ پانی سے کلی کرنے کے بعد جب رانی بستر پر لیٹی تو وہ کراہ رہی تھی۔ آنسوؤں کی ایک دھار تھی جو اس کی بے نور آنکھوں سے بہتی ہوئی اس کے زرد گالوں پر پھیل رہی تھی۔ راج تڑپ اٹھا۔ "رانی مت رو۔ تو فکر مت کر۔ میں تیرا اچھے سے اچھا علاج کراؤں گا۔ اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کر دکھاؤں گا۔ اپنی دنیا تجھ پر لٹاؤں گا۔ دیکھنا تو بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔"

مگر رانی بے حس پڑی رہی جیسے وہ ان کھوکھلے جملوں کی بیساکھی کا سہارا لیے بغیر بہت دور تک آگے نکل آئی ہو۔ جیسے وہ جانتی ہو کہ راج تو کب کا اپنی دنیا لٹا چکا ہے اس کے علاج پر اپنا سب کچھ ختم کر چکا ہے سونا نے کراہتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ "راج"

راج چونک پڑا "کیا ہے رانی؟

"ایک وعدہ کرتے ہو ـــ"

"وعدہ کیسا وعدہ؟ رانی میں اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو سنو۔" رانی کے ماتھے پر کرب ناک سلوٹیں پھیل گئیں۔ "میں مر جاؤں تو میرے جنازے پر بینڈ ضرور بجوانا جس ٹھاٹ باٹ سے مجھے اپنے گھر لائے تھے اسی ٹھاٹ سے وداع بھی کرنا۔"

"رانی ۔۔۔" راج بلک پڑا۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جیسے الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے مونا بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب ملاقات کا وقت ختم ہو گیا اور راج اداس ہو کر جانے لگا تو مونا کی آواز جیسے کہیں دور سے آ کر اس کے کانوں سے ٹکرائی "راج سنو تو۔" راج رک گیا

"کیا ہے رانی ۔۔۔؟"

"راج اب سمے گزر چکا ہے نہ جانے آج میرا من منّے کو دیکھنے کیلئے اس قدر بے چین کیوں ہے اسے دیکھے ہوئے چھ مہینے ہو گئے۔ نہ جانے اب کتنا بڑا ہو گیا ہو گا کل اسے اپنے ساتھ لیتے آنا۔"

اس ساری رات اس کی نظریں روشندان میں گڑی رہیں۔ ساری رات وہ بخار میں تپتی رہی۔ دوسرے دن ملاقات کے وقت تک وہ تین مرتبہ خون کی قے کر چکی تھی۔

جب راج اور منّا اس کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو اس نے ڈوبی ہوئی نظروں سے راج کی طرف دیکھا۔

"کتنی دیر کر دی تم نے راج۔ کتنے سال گزر گئے تمہارا انتظار کرتے کرتے اور تو منّا۔ میرے لال ۔۔۔ تُو تو بالکل ہی اپنی ماں کو بھول گیا ۔۔۔ منّا اچک کر اسٹول سے اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ماں کے گلے میں اپنی ننھی ننھی باہیں ڈال دیں۔ آج مونا نے اسے دور رہنے کیلئے نہیں کہا بلکہ اسے کھینچ کر اپنے کھوکھلے سینے سے لگا لیا۔" ماں ۔۔۔۔ ماں ۔۔۔۔ تو گھر کیوں نہیں چلتی ۔۔۔۔۔۔ تو یہاں کیوں رہتی ہے ۔۔۔۔۔ گھر چل نا ماں ۔۔۔۔۔"

"چلوں گی بیٹا ضرور چلوں گی اور اس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ منّے کی

پیشانی پر رکھ کر آنکھیں موندلیں، جب کافی دیر تک مونا نے کوئی حرکت نہ کی تو راج نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دینا چاہا تبھی اسے معلوم پڑا کہ مونا تو کہیں بہت دور چلی گئی ہے۔

وہ بلک بلک کر رونے لگا " بیٹے منے چھوڑ دے اپنی ماں کو چل آج تیری ماں تیرے ساتھ گھر چلے گی۔"

---

دوسرے دن صبح کو جب راج کے گھر میں عزیز و اقارب کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور مونا شادی کا جوڑا پہن کر صندوق میں لیٹ چکی تھی۔ اس نے شہر کے مشہور بینڈ والوں کو بلوایا۔ پہلے تو وہ میت پر باجا بجانے پر تیار نہ ہوئے مگر جب انھیں مرنے والی کی آخری خواہش کے متعلق بتایا گیا تو وہ بادل نخواستہ رضامند ہو گئے۔ راج بھی پچھلے سے کمرے میں جا کر اپنا شادی کا جوڑا پہن آیا جیسے وہ آج دولہا بن کر جا رہا ہو جب مونا کا صندوق اٹھایا گیا تو اسے ایسا لگا جیسے کہاروں نے مونا کی ڈولی اپنے کاندھوں پر لے لی ہو وہ بے حس و حرکت جنازے کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ کسی نے کہا ایک دو تین۔ تو سازوں کے سینوں سے کسی فلم کے اس مشہور گانے کی تان پھوٹ پڑی

سٹی زندگی اور غم مسکرائے

سبھوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے مگر راج خاموش کھویا کھویا۔ لٹا لٹا جنازے کے پیچھے چل رہا تھا۔ راستہ میں چلتے لوگ بھی یہ سوچ رہے تھے

—" یہ جنازہ جا رہا ہے یا جنازے کی بارات۔"—

---

# شبنم یا آنسو

پادری مسیح داس نے جوانی کی تیس بہاریں شہر میں گزاری تھیں، اور اب تھکے ہوئے ماہی گیر کی طرح وہ ماچھی واڑہ کا ایک پادری بن کر رہ گیا تھا، اسکے سر کے بال بھوسے کی مانند ہو گئے تھے کندھے تھکے بیل کی طرح اندر کو ڈھلک سے گئے تھے۔ چہرہ اپریل کی اجڑتی ہوئی بہار کی طرح اداس ہو کر رہ گیا تھا شروع شروع میں جب اس نے منادی کا کام کیا تھا تو اس کے سر کے بال سیاہ اور چمکیلے تھے، اور چہرہ پر تازگی تھی، بات بات پر مسکرانا ایک عادت سی تھی، خود ہنستا تھا، دوسروں کو ہنساتا تھا ہر ملاقاتی سمجھتا تھا کہ وہ پادری مسیح داس سے مل کر نہیں آرہا بلکہ اس نے بہار کی شبنم سے بھیگے ہاتھوں سے مصافحہ کیا ہے۔ اس کتابِ خدمت کا پہلا ورق پلٹنے سے پہلے اس نے بڑے رنگین خواب دیکھے تھے اسے ان خوابوں کے درمیان ایک خوبصورت محل کی جھلکیاں دکھائی دی تھیں۔ اور اس کے اوپر کا آسمان نہایت گہرا نیلا اور شفاف تھا، اور پادری مسیح داس نے کئی دفعہ اس چمکیلے آسمان کو چھو کر دیکھا تھا، کبھی نیلے پیلے تارے اس کی خوش نصیبی کے افق پر چمکتے تھے، اور کبھی ان کی زرد روشنی اسے ہمالیہ کی برف آلود چوٹیوں پر لے جاتی، اور کبھی خوابوں میں ڈوبی نیم وا آنکھیں اسے ان دیکھے جزیروں میں لے جاتیں جہاں

وہ سمندر پر جھاگ اٹھاتی سفید سفید لہروں کو بالکل اپنے قریب محسوس کرتا۔ ایسے وقت مسیح داس کے قدم ان جزیروں کی طرف اٹھ جاتے، اور وہ اچانک گہری نیلی پرسکون جھیلوں کے کنارے آنکلتا۔ مشرق کے گھنے مرطوب جنگلوں میں سے گزر کر آنے والی ہوا اس کے دامن کو خوشبو سے معطر کر دیتی، اور وہ اپنے دامن میں کنول کی سفید اور نیلی کلیاں چن کر ان جھیلوں کے قدموں پر رکھ دیتا اور جھک کر کنارے کی مٹی کو اپنے ماتھے پر لگا کر عقیدت سے اپنے سر کو جھکا دیتا۔ خوشی اور مسرت کے آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگتے اور اسے اپنی خوش بختی پر رشک آ جاتا۔

مگر جب تاریکی کی روشنی نے اس کی کتاب زندگی کا دوسرا ورق پلٹا تو مسیح داس ایک دم گھبرا اٹھا، تازگی اور مسرت کا وہ پھول خاک پر گر پڑا، اور اس کی پنکھڑیاں دھوپ کی تمازت سے مرجھا کر رہ گئیں...... وہ چمکیلا آسمان ایک دم سیاہ اور ڈراؤنا سا لگ رہا تھا، اور تاروں کی رنگین گود سونی سی ہو کر رہ گئی تھی، اور جب وہ اپنے دامن کو پھیلاتا تو کرکراتی ریت اس کے دامن میں بھر جاتی، اور ویرانگی کا تصور اس کے خوابوں پر پردے کی طرح پڑ جاتا، اب جن پھولوں کو اس نے جھیلوں کی بھینٹ کے لئے اکٹھا کیا تھا، وہ ببول کے سوکھے کانٹے نکلے، رتنا کلی کی بیل مرجھا کر جوہی کی جھاڑیوں سے لپٹ کر مردہ ہو چکی تھی، اور جوانی کے خوبصورت دریچوں کے تمام رنگین پردے پھٹ چکے تھے، اور ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کے درمیان کھڑا پادری مسیح داس اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ریگستانوں کا تھکا مسافر تھوڑی دیر کے لئے رکا تھا۔

یہی حال اس کی بیوی کا تھا، دلہن بن کر کرائے کی موٹر میں چرچ تک آئی تھی آرزوؤں کی مدھم روشنی کو اس نے اپنے بالکل قریب مچلتے محسوس کیا تھا، ارمانوں کی ریت بیل کے پاس اس نے وفا کی کلیوں کو چن کر پادری مسیح داس کے قدموں پر ڈالا تھا

پادری کی بیوی بننا الف لیلیٰ کی کہانیوں سے کہیں زیادہ لطف آگیں تھا۔ اور ان سدا بہار اور گلاب کی کلیوں کو لے کر وہ اس کے گھر آئی تھی، جب پہلی رات آسمان پر چاند چمکا تھا تو مریم نے اسے جی بھر کر دیکھا اور دعا مانگی تھی ........

وہ اس گھر میں نہ معلوم کیا کیا تمنائیں لے کر آئی تھی ..... چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ دعا مانگ کر اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو اس کی انگلیوں سے نور ٹپک رہا تھا۔ اور خوشیوں کے بادلوں نے اس کو گھیرا ہوا تھا، اس نے جوش میں آ کر گلاب کے پھولوں کو بکھیر دیا اور اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا کر ایک لمبا سانس لیا آج ہوا نکھری نکھری سی تھی اور ایسا کچھ دودھ کی بو رچی ہوئی تھی آج کی اس ہوا میں ایک خوبصورتی تھی، ایک مہک تھی اور لطف آگیں سرور تھا آج ہوا کے دوش پر نیک جذبات اور خدمت کی پریاں اپنے اپنے سفید پر پھیلائے مریم کے پاس کھڑی تھیں ان کے ہاتھوں میں رباب تھے، اور ان ربابوں پر گلستانوں کے آدھی رات کے گیت تھے مریم نے اپنے جوڑے کی کلیاں کھول کر پادری مسیح داس کی محبت کی دہلیز پہ ڈال دی تھیں اور جوڑا کھول کر بدوش شانوں پر پریشاں ہونے کے لئے نہیں بلکہ پادری کی تھکی ہوئی شاموں کے لئے رکھ چھوڑا تھا، مریم کے ہاتھوں میں جہاں مہندی کی خوشی رچی ہوئی تھی۔ وہاں اس کی آنکھوں میں سرسبز مرغزاروں کا تصور تھا، اور خیالی خیابانوں کے دبیز سائے تھے۔

یہ زندگی خوابوں کی دنیا ہے شادی خواب میں ہوتی ہے، اولاد خواب میں ہوتی ہے ـــــ اور رنگین اور کبھی خشک خوابوں میں انسان کا مستقبل لپٹا رہتا ہے ہزاروں تمنائیں خوابوں کے محلوں کے حریری پردوں کے پیچھے چھپی مدھم مدھم دکھائی دیتی ہیں۔ اور آخر یہ زندگی کا چکر دیکھے ان دیکھے خواب کے چکر میں جا کر ختم ہو جاتا ہے جب پادری اور اس کی بیوی نے ان خوابوں کی دنیا پر قدم رکھے تھے تو وہاں

سبز گھاس لہلہا رہی تھی، اور گھاس کے فرش پر شبنم نے اپنے موتی بکھیر رکھے تھے آفتاب کی پہلی کرنوں نے شبنم کے معصوم ماتھے پر ایک ہلکا سا بوسہ دیا تھا، اور اب وہ دوشیزہ شرم سے لجائی ہوئی ہرے آنچل میں اپنا منہ چھپا رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ خورشید کی اس پہلی کرن نے جہاں اوس کو شرم دی تھی، وہاں اس نے گلنار اور گلاب کے پھولوں کو زندگی بخشی تھی، اس نے چنبیلی کو سفید اور گلاب کو سرخ رنگ دیا تھا، اور اس قوت بخش طاقت نے پادری اور مریم کو بھی ایک روشن مستقبل دکھایا تھا۔ ان آئیزالے دنوں میں سورج خوب روشن تھا، اور وہ گہرے نیلے آسمان پر چمکتا ہوا بڑا ہی بھلا لگتا تھا، اس کی دھوپ بہت صاف اور چمکیلی تھی، ان دنوں ایسا لگتا تھا جیسے یہ دونوں جب چاہیں ہاتھ بڑھائیں اور آکاش آسانی سے چھو لیں۔

مگر پچھلے ۲۰ سالوں سے مسیح داس نے اور اس کی بیوی نے اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کیا تھا، اور کمی تھی اولاد کی۔ اتنے سرد گرم ایام برس گزر جانے کے بعد بھی ان کا گھر ایک بچے کے وجود سے خالی رہا تو انہوں نے ایک یتیم بچی کو اپنا سہارا بنا لیا

کانتا اب یتیم نہ تھی، بلکہ اس کا ایک باپ تھا جس کا نام پادری "مسیح داس" تھا اور ایک پیاری سی ماں تھی "مریم" جس نے چھوٹے موزوں کی دنیا سے اسے ساڑھی کی دنیا تک پہنچا دیا تھا، لیکن کالج کی کھلی اور مرطوب فضا نے کانتا کو بتا دیا تھا کہ اسکی ماں مریم کو ساڑھی باندھنی نہیں آتی، کیونکہ ساڑھی اور بالوں کے فیشن ہر سال بدل جاتے ہیں۔ مگر مریم پچھلے اٹھارہ سال سے ایک ہی طرح کے بال بناتی تھی اور ایک ہی طریقہ سے ساڑھی باندھتی تھی۔

کالج کی فضا نے اگر اتنا ہی سکھایا ہوتا تو شاید اس کے ماں باپ کو کچھ دکھ نہ ہوتا مگر معلوم ایسا ہوتا تھا کہ کالج میں عشق و محبت کے درس کو عام تعلیم سے زیادہ ہی پڑھایا

جاتا تھا اور کانتا نے اس محبت کی تعلیم کے کورس کو بہت جلدی ختم کر لیا تھا۔

جب یہ متعدی مرض کسی نوجوان کو لگ جاتا ہے تو ماں باپ اس کو اپنے سب سے بڑے دشمن نظر آتے ہیں، پادری اور اس کی بیوی بار بار اپنی بیٹی کو سمجھاتے کہ مسیحی لڑکی کا کسی غیر مسیحی سے ایسا تعلق اچھا نہیں ہوتا کسی نے محبت کیلئے کہا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے یہ بہت بڑا جھوٹ ہے محبت نہ اندھی ہوتی ہے نہ بہری بلکہ محبت تو بڑی چالاک اور ہشیار ہوتی ہے بیوقوف کو عقل، اندھے کو آنکھیں سیدھے سادھے کو ہوشیاری عطا کر دیتی ہے محبت کا مارا تمام دنیا کو بے وقوف بنانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، یہی حال کانتا کا تھا، وہ جو پہلے ہمیشہ سچ بولتی تھی اب اس صفائی سے جھوٹ بولنے لگی تھی کہ ہر جھوٹ پر سچ کا گمان ہوتا تھا، پہلے اس میں بناوٹ نہ تھی، اب اس کی ہر بات میں بناوٹ تھی اور ہر بناوٹ ایک سچائی تھی اور اسی منتر کے سہارے وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کی آنکھوں پر اپنی معصومیت اور پاکیزگی کے دامن کو پھیلا دیتی تھی۔ عورت کی محبت سورج کی طرح آہستہ آہستہ پروان چڑھتی ہے مگر جب محبت کا سورج آسمان پر چڑھ جاتا ہے تو پھر ہر سامنے والی چیز کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، کانتا کی محبت سریندر سے ایسی تھی، اس محبت کی آنچ نے جہاں کانتا اور سریندر کو روشنی اور مسرت بخشی تھی وہاں اس آنچ نے کانتا کی عصمت کی چادر کو جگہ جگہ سے چھلنی کر دیا تھا۔ جب بوڑھے ماں باپ اسے دیکھتے تو آہ بھر کر رہ جاتے مسیح داس چونکہ مرد تھا وہ بیٹی کے غم کو مردوں کی طرح برداشت کر رہا تھا، مگر مریم کا نازک دل ہر وقت بے بسی اور غم سے لرزتا رہتا اور وہ جب کبھی بیٹی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی تو سینہ سے ایک آہ نکل جاتی، یہ ایک غم تھا، ایک بیماری تھی جو اس کی روح کے ساتھ ساتھ اس کے کمزور بدن کو بھی کھائے جا رہی تھی، غم کا عفریت بوڑھی بیمار ماں کا خون آہستہ آہستہ چوس رہا تھا، اور اب مریم کو اٹھتے بیٹھتے چکر آتے تھے

مگر غم نے زندہ انسانوں کے دامنوں کو کب چھوڑا ہے؟

ایک دن مریم نے کانتا کو بلا کر کہا۔

"بیٹی میں نے تمہاری شادی کا بندوبست مرقس کے ساتھ کیا ہے تم دونوں بچپن کے ساتھی ہو، اور پھر وہ لڑکا تم سے پیار کرتا ہے۔ یقیناً تمہیں خوش رکھے گا۔"

"مگر امی!" — کانتا نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بیٹی میں چاہتی ہوں، اس اکتوبر میں تیرے ہاتھ پیلے کردوں۔"

"نہیں ماں نہیں ..... میں شادی کروں گی۔ مگر سریندر کے ساتھ۔ ورنہ ساری عمر کنواری رہوں گی۔"

دکھی ماں نے آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر بیٹی کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں غم اور التجا کے ملے جلے جذبات ابھر رہے تھے۔

"بیٹی وہ لڑکا تیرے لائق نہیں اور پھر وہ مسیحی بھی نہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

فرق پڑتا ہے بیٹی۔ اور اس فرق پر ہی ایک مسیحی کہلاتا ہے اور دوسرا غیر مسیحی ہر ماں اپنی بیٹی کو سکھی دیکھنا چاہتی ہے۔

"تم فکر نہ کرو ماں! میں اس سریندر کے پاس دکھی نہ رہوں گی۔"

تم جانتی ہو بیٹی میں دل کی مریضہ ہوں، میری خوشی کے لئے میری بات مان لو بیٹی میری آخری خواہش کو مان لو بیٹی ..... پتا نہیں میں کتنے دن کی مہمان ہوں۔"

"ایک بار کہہ دیا، اگر زیادہ تنگ کروگی تو میں زہر کھالوں گی، مگر مرقس سے شادی ہرگز نہ کروں گی۔" یہ کہہ کر کانتا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ٹوٹے ہوئے دل اور کمزور سانس والی مریم تمام دن یہی سوچ کر روتی رہی کہ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ بوڑھے دل میں نہ جانے کہاں سے یہ وسوسے پیدا ہوگئے۔

اگر کانتا نے زہر کھا لیا..... اگر کانتا مر گئی..... تو پھر کیا ہوگا؟ شام کو مسیح داس نے اپنی..... کمزور بیوی کو بہت تسلی دی۔ مگر خزاں کو کبھی درخت روک سکتے ہیں؟ خزاں کا زرد ٹھنڈا ہاتھ اب خشک ہواؤں کے ساتھ اڑتا چلا آرہا تھا، اس نے مریم کے گھر پہ آکر دستک دی، بوڑھی مریم نے سر اٹھا کر جاتی بہار کو دیکھا، مگر اس صحرا میں بہاروں کا کہیں دور دور تک پتا نہ تھا، اس کے سامنے بس ایک میدان تھا۔ جس میں گندا پانی بھرا تھا اور پانی سے تعفن اٹھ رہا تھا، کہیں کہیں سبز کائی اس گندے پانی پر جمی ہوئی تھی، مریم نے غلطی سے اس کائی پر قدم رکھے اور پھر نہ جانے وہ کون سی گہرائیوں میں چلی گئی......

شاید یہ گہرائیاں انسان کے لئے ازل سے بنی ہیں جس کی انسان کو کچھ خبر نہیں، بس ایک بھولے بھٹکے پرندہ کی طرح وہ وسیع آسمان میں اپنی منزل کے لیے پھڑپھڑاتا پھرتا ہے اور آخر تھک کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اور پھر اس کے پر و بال ہوا کے ساتھ منتشر ہو جاتے ہیں، اور کوئی نام لیوا تک نہیں رہتا۔

صبح اٹھ کر مسیح داس نے مریم کو پہلی اور دوسری آواز دی تھی، مگر پہلی اور دوسری آواز بازگشت بن کر رہ گئی، بوڑھے پادری کے ہاتھ میں اس کی رفیقہ کا سرد ہاتھ تھا، اور لوگ مریم کے پلنگ کے ارد گرد اگربتیاں لگا رہے تھے۔ کچھ لوگ دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے، وہ کبھی سفید بالوں سے بھرے ہوئے پادری کی طرف دیکھتے، کبھی اگربتیوں کے چکراتے ہوئے دھوئیں کو

...... باہر ایک گاڑی رکی۔ جس میں تابوت تھا، اور لوگ دھیرے دھیرے چلتے اس کو کھینچے لے جا رہے تھے، گھنٹہ کی ہر پر درد چوٹ کے ساتھ کبوتروں کی ٹولیاں ذرا دیر کے لئے چرچ کے گنبد سے اڑ جاتیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بیٹھنے کے لیے پر تولنے لگتیں۔ اب چرچ کا گھنٹہ خاموش ہے، پادری خاموش ہے

آج پادری کا سارا گھر خاموش ہے، باہر تاریکی نے اپنے آنچل کو ہر طرف پھیلا دیا ہے، وہ بچوں کے لئے میٹھی لوریاں لے کر آئی ہے۔ لیکن بوڑھے پادری اور کانتا کے لئے آنسو اور آہیں لے کر آئی ہے گھر میں لیمپ کی زرد روشنی پھیلی ہوئی ہے، کمرہ کے کچھ کونے ابھی تاریک ہیں، کچھ کونوں پر آج ہی مکڑی نے جالا پھیلا دیا ہے، کانتا کے سامنے کھانا پڑا ہے، پادری کے سامنے کھانا پڑا ہے۔ کانتا چپ چاپ بیٹھی کھانے کو دیکھ رہی ہے۔ اس نے دیکھا دو بوڑھے جھریوں بھرے ہاتھ آگے بڑھے ان ہاتھوں میں ایک کانچ کی پرانی چوڑی ہے ان سوکھے اور کمزور ہاتھوں نے رکابیوں کو اٹھایا، اب یہی ہاتھ ان رکابیوں سے کھانا نکال کر ایک چھوٹی خوبصورت بچی کو کھلا رہے ہیں اپنی نرم و خشک ہاتھوں نے اب تولئے سے اس بچی کو گود میں اٹھا لیا ہے، وہ تھپک تھپک کر اسے سلا رہے ہیں یہی ہاتھ جوان کانتا سے کہہ رہے ہیں" کھانا کھا لو میری بیٹی ..... کھانا کھا لو میری بچی"...... اب یہ ہاتھ کانتا کی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں" مت رو میری بیٹی تمہارے رونے سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔"

یہ سرد بوڑھے ہاتھ بوڑھے ناتواں پادری سے کہہ رہے ہیں" میرے پرانے میرے پیارے خاوند، میں نے ہمیشہ روکھی سوکھی تمہیں کھلائی ہے لو آج پھر یہ باسی روٹی میرے ہاتھوں سے کھا لو اور ہمیشہ کی طرح خدا کا شکر ادا کر کے سو جاؤ۔

کانتا نے چاہا کہ ان ہاتھوں کو چوم لے وہ ایک دم اٹھی اور اپنے بوڑھے باپ سے لپٹ گئی۔ آج وہ اپنے بزرگ باپ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ آج اس بوڑھے درخت کی جڑیں ہل رہی ہیں۔ اس کی پتیاں مرجھا کر نیچے گر رہی ہیں، اب اس میں وہ طاقت کہاں، وہ توانائی کہاں، اب اس درخت پر چند ہی پتے

رہ گئے ہیں۔ اب اس درخت کے نیچے ایک ہی پھول رہ گیا ہے باقی پھول ہوا کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں۔ نجانے ان کی پنکھڑیاں کہاں بکھر گئی ہیں، یہ نیچے پڑا ہوا پھول بھی ایک دن چلا جائے گا، پھر یہ کمزور درخت کہاں ہو گا۔ پھر یہ کہاں ہو گا۔؟

نومبر کی ایک سرد رات کو بوڑھے باپ نے بیٹی سے پھر شادی کا ذکر کیا "بیٹی میں کب تک زندہ رہوں گا۔ خدا بہتر جانتا ہے، کب تک تمہارے ساتھ چل سکونگا، کچھ کہہ نہیں سکتا، میری منزل سامنے ہے میں اپنے سرہانے ایک دیئے کو جلتا ہوا دیکھ رہا ہوں، اس لئے چاہتا ہوں ..... مرنے سے پہلے تمہاری شادی مرقس سے کردوں۔ سریندر کو تم نے آزما لیا، جیسا وہ نکلا تمہیں پتا چل گیا۔ مرقس کو سب کچھ معلوم ہے۔ پھر وہ بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"پتا جی، میں نے خوب دیکھ لیا کہ غیر مسیحیوں میں وفا کتنی ہوتی ہے، اب میں آپ کا کہنا مانوں گی ...... آپ جیسا بہتر سمجھیں کریں ...... مجھے منظور ہے ........"

پادری مسیح داس نے آہ بھرتے ہوئے کہا "کاش یہ سب کچھ تمہاری ماں کے سامنے ہو جاتا ......" کانتا کی آنکھیں بھر آئیں، وہ اٹھ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی ....... پادری نے مرقس سے بات کی تو اس نے پادری کا ہاتھ پکڑ کر کہا "پادری صاحب میں کانتا اور سریندر کے تعلقات کو خوب جانتا ہوں ...... مگر میرے گھر میں کانتا کو وہی درجہ ملے گا جو ایک شریف بیوی کو ملنا چاہیئے لیکن میں چاہتا ہوں، اگر ۲۴ر دسمبر کو شادی ہو جائے تو بہتر ہے۔" پادری کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے، اور دل شکر گزاری سے بھرا ہوا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ چین اور سکھ کے سمندر میں

آہستہ آہستہ تیرتا چلا جا رہا ہو۔ یہاں سکون ہی سکون ہے ..... لذت ہی لذت ہے، اور ایک بے پناہ مسرت کا نشہ ........ چرچ سجا ہوا ہے ...... کاغذ کی رنگ برنگی زنجیروں نے چرچ کی رونق کو بڑھا دیا ہے، گل داؤدی کے سپید اور زرد پھول گملوں میں مسکرا رہے ہیں، چرچ کا خادم ان رنگین چاولوں اور پھولوں کی پتیوں کو اٹھا کر باہر پھینک رہا ہے، ان چاولوں اور پنکھڑیوں نے کچھ دیر پہلے ایک دلہن اور دولہا کے قدموں کو چوما، کچھ دلہن کے خوبصورت گالوں پر گرے تھے۔ کچھ دولہا کے بالوں میں اٹکے تھے، یہ وہ خوش بخت ستارے تھے جو تھوڑی دیر کے لئے آکاش کو چھوڑ کر اس دھرتی پر ایک نئے جوڑے کو مبارک باد دینے آئے تھے، لیکن اب ان کے قالب بدل چکے تھے وہ محض پتیاں اور پنکھڑیاں یا پنی کی رنگ برنگی تتلیاں تھیں ...... جنہیں چرچ کا خادم اٹھا کر باہر پھینک رہا تھا۔ اور صبح کی عبادت کے لئے لوگ آئیں گے ........ رنگین ریشمی ساڑھیاں باندھے خوبصورت عورتیں آئیں گی ...... سیدھی سادی دھوتیاں باندھے مہربان چہرے والی مائیں آئیں گی سفید بالوں اور جھریوں سے بھرے چہرے والے بزرگ واکینگ اسٹک کا سہارا لئے ہوئے آئیں گے، بھولے بھولے سرخ گالوں والی کمسن بچیاں گلوں میں رنگ برنگی مالائیں ڈالے ادھر سے ادھر پھریں گی۔... بھولے بھالے بچے اپنے ماں باپ کی انگلیاں پکڑے بار بار اپنی ماں سے، کبھی اپنے باپ سے پوچھیں گے۔ "پاپا کرسمس فادر کہاں ہے، پاپا کرسمس فادر انعام دے گا"؟ کچھ ماں باپ اپنے بچوں کو پیار سے سمجھائیں گے، کچھ انکو جھڑکتے ان کو گھسیٹتے چرچ لائیں گے۔

پادری مسیح داس نے آج خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات سے

مغلوب ہو کر عبادت شروع کی ..... اس سال کا بڑا دن غم کے ساتھ خوشی لایا تھا ..... دوران عبادت مسیح داس کی آنکھیں بار بار اس نئے جوڑے کو تلاش کر رہی تھیں ...... مگر وہ دونوں کہیں نظر نہیں آ رہے تھے وعظ کے بعد جب پادری، اشتہار سنانے کے لئے کھڑا ہوا تو ایک رقعہ انکو چرچ کے خادم نے لا کر دیا۔ پادری نے رقعہ پڑھا اور لرزتی آواز سے کہا "آپ لوگوں کی زندگی میں بہت سے بڑے دن آئیں اور ہر بڑا دن آپ کیلئے خوشی لائے" وہ تھوڑی دیر کے لئے رکے انہوں نے شرکار کے اوپر سے گاتھک طرز کے بنے ہوئے دروازہ کو دیکھا اور پھر ایک کھوکھلی آواز میں کہا۔ "آج شام کو مسز مرقس یعنی میری بیٹی کا جنازہ ۴ بجے ہوگا۔" اچانک مرقس نے پادری کو ایک رقعہ دیا۔ اور کہا پادری صاحب آپ دعا کیجیئے اور پھر مرقس کے قدموں کی چاپ تاریکی کے ساتھ مل گئی۔ مسیح داس نے رقعہ کھولا، پڑھا۔

میرے پیارے شوہر!

"میں تمہیں کتنا پیار کرنے لگی ہوں اس کا اندازہ تم نہ کر سکو گے اپنے پیار کا واسطہ دے کر کہتی ہوں تم ہمیشہ خوش رہنا۔ اور کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لینا ..... تم نیک اور شریف انسان ہو ...... اور میرے پاس صرف ایک ناپاک جسم ہے ..... گندہ جسم ....." انسان اپنے دیوتا کے سامنے ہمیشہ اچھی چیزیں بھینٹ چڑھاتا ہے، میرے مالک میں یہ گندا جسم آپ کو پیش نہیں کر سکتی، آج اپنی روح اور محبت آپ کی بھینٹ کرتی ہوں، میری موت کا غم نہ کرنا، بابا سے کہنا کہ میرے گناہوں کی معافی کیلئے دعا کریں۔"

آپ کی کانتا

چرچ کے اندر ایک کمزور ناتواں بوڑھا، آدھی رات کے وقت ایک لالٹین لئے گھوم رہا ہے، وہ اس جگہ کو دیکھ رہا ہے، جہاں کل ایک جیتی جاگتی دلہن کھڑی تھی۔ کبھی اس جگہ کو دیکھتا، جہاں اس نے ایک نوجوان لڑکی کا ہاتھ ایک نوجوان لڑکے کے ہاتھ میں دیا تھا۔ آنسو ٹپک ٹپک کر اس کی قمیض پر گر رہے ہیں، اس نے لالٹین کو نیچے فرش پر رکھ دیا، اور اب جھک کر اس نے فرش پر بکھرے ہوئے کچھ رنگین چاول کے دانوں کو اٹھایا اب وہ ٹکٹکی باندھے ان رنگین چاولوں اور گلاب کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیوں کو دیکھ رہا ہے، اچانک اس نے انہیں اپنے ہونٹوں سے لگا کر چوما، اور اپنی جیب میں ڈال لیا، اب یہ بے بس بوڑھا الماری کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے الماری میں سے شادی کا رجسٹر نکالا اور ۲۴ تاریخ کو کیے گئے ایک دستخط کو غور سے دیکھتا رہا۔ اور پھر ایک سفید سر جھک گیا، اس کے ٹھنڈے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہونٹوں نے اس دستخط کو پیار کیا اور اسی لمحہ دو گرم اور موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر رجسٹر پر گر پڑے اور اسی لمحہ دو کانپتے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے اور بزرگ پادری کا سر دعا کے لئے جھک گیا، باہر سے ٹھنڈی ہوا گرجے کی کھڑکیوں سے گزرتی ہوئی بار بار یہ کہتی ہے یہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعا کہاں پہونچ رہی ہے، کہاں پہونچ رہی ہے ــــ؟

رات نہایت سرد اور سنسان تھی، اور ہوا بھی نہ جانے کن برفیلے کھنڈروں سے گزر کر آرہی تھی کہ اس کی زبان پر نغمہ کی بجائے نوحہ تھا۔ دور کہیں ایک آدھ پٹاخے کے پھوٹنے کی آواز ایک لمحہ کے لئے موت کے راگ کو منتشر کر دیتی تھی لیکن یہ آواز بھی مسلے ہوئے پٹاخوں کی طرح تھی، ایک ٹولی کرسمس کے باسی گانے گاتی ہوئی موم بتیاں ہاتھ میں لئے تیسرے چوک سے گزر کر

چرچ سے پرے چلی گئی۔

ان آوازوں اور تاریکیوں سے پرے وہ لیٹی تھی، جس نے ایک نوجوان اور خوبصورت چہرے والے مسیحی کو چاہا تھا، جس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اس نے کہا تھا "میرے پیارے میں اس دنیا کی آخری دہلیز تک تمہاری ہوں اور اس دنیا کے آنگن میں تمہارے قدموں پر پھول رکھوں گی، امید کا وہ سہ رنگا مینار جس سے محبت اور سچائی کی شعاعیں پھوٹا کرتی تھیں لرز اٹھا آج اس مینار کی اوپر کی منزل گر پڑی ہے اور رات کی ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی اس کی محرابوں کے نیچے سے گزر رہی ہے آج نہ چاندنی ہے نہ اندھیرا ہے۔

اب ایک بے چارگی ہے اور اس پر رونے والی ایک شمع ہے جو اس کی قبر پہ جل رہی ہے۔ پاس ہی شہتوت کے چھدرے درختوں کے پتوں کی شبنم ننھے ننھے قطروں کی صورت میں اس کی قبر کی تازہ مٹی میں جذب ہو رہی ہے۔

# بچّوں کا بڑا دن

مسٹر ولسن کے بنگلہ کے سامنے ہری ہری گھانس کا لان تھا۔ جس کے چاروں طرف خوبصورت پھولوں کی بیج لگی ہوئی تھی۔ یہ سرسبز میدان بچوں کیلئے کلب گھر کا کام دیتا تھا۔ شام ہوتے ہی آس پاس کے تمام بچے اس لان میں جمع ہو جاتے تھے۔ سب مل کر چیختے چلاتے۔ گاتے۔ ناچتے۔ کھیلتے کودتے کہانیاں سناتے۔ باتیں کرتے۔ کوئی اپنی ماما کی تعریف کرتا کوئی شکایت۔ کوئی پاپا کو اچھا بتاتا کوئی برا۔ کوئی بھیا کا گلہ کرتا کوئی بڑی بہن کا۔ کسی کے گھر میں کوئی نئی چیز آتی تو اس کی اطلاع سب کو دی جاتی کسی کو نیا کھلونا ملتا تو جب تک اسے کلب میں نہ دکھایا جاتا چین نہ آتا۔ شام کے وقت کسی کے ہاتھ میں گڑیا کسی کے گیند۔ کوئی اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر سوار کوئی لکڑی کے گھوڑے پر۔ غرضکہ بچوں کی یہ جماعت بغیر کسی تنظیم کے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھی۔ اور یہ کام تھا کھیلنا۔ کودنا۔ رونا۔ ہنسنا۔ جھگڑنا اور پھر ایک ہو جانا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ گھر گھر میں کرسمس کا چرچا تھا۔ کرسمس کی تیاریاں تھیں بچے بڑی مشتاق نظروں سے گھر میں ہونے والی تمام کاروائیاں دیکھتے، سنتے

اور پھر خوش ہو ہو کر شام کو اپنے کلب میں بیان کرتے۔

”آج ہمارے پاپا ماما کے لئے بڑی اچھی ساری لائے ہیں۔ یہ بڑے بڑے پھول ہیں اس پر۔“ الفریڈ نے کہا۔

”میلے ڈیڈی تو چھندل سا چھوٹ لائے ہیں۔ نیلا نیلا“ توتلی شیلا بولی۔

”ہماری ممی تو ہمارے لئے سونے جاگنے والی گڑیا لائیں گی۔“ اندرا نے اطلاع دی۔“

میرے بھیا مجھے ایک سائیکل انعام دیں گے۔ اس میں رکشا بھی لگی ہوگی۔ میں خوب چلایا کروں گا۔“ انیل نے خوش ہو کر کہا۔

”مجھے بھی بٹھایا کرے گا نا؟ سیری نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تو میں تجھے اپنا باجا نہیں دوں گی۔“

”کون سا باجا؟“

”جو مجھے ملے گا۔“

غرضیکہ آج کل کلب میں اسی موضوع پر گفتگو رہتی تھی۔ کلب کے تمام ممبران اس دلچسپ گفتگو میں حصہ لیتے تھے۔ لیکن وہاں ایک ایسی لڑکی بھی تھی جو خاموشی کے ساتھ سب کی باتیں بغور سنتی رہتی پر خود کچھ نہ بولتی تھی اس کا نام ہتھارو بی۔ جب بڑے دن کے تین چار روز رہ گئے تو کھانے پینے کی چیزوں کا تذکرہ ہونے لگا۔

ایک نے کہا۔“ ہمارے یہاں اتنا بڑا کیک بنے گا۔“

دوسرے نے کہا۔“ میرے گھر تو خوب ڈھیر سی مٹھائی آئے گی۔“

تیسرا بولا "میرے پاپا سو امرود۔ دو سو سنترے اور دو سو کیلے لائیں گے۔"

"سو امرودوں کا کیا ہوگا۔ چھوٹا" کسی نے سوال کیا۔

"ہوگا کیا۔ ہم کھائیں گے۔ برجستہ جواب ملا۔

جب سب اپنا حال بیان کر چکے تو سندر نے روبی سے کہا۔

"اور تیرے پاپا کیا لائیں گے۔

"ارے ہاں اس نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔" آندرا نے لقمہ دیا۔

"بول نا" مارگریٹ نے آنکھیں نکالیں۔

"بڑی چالاک ہے۔ اپنے گھر کی کوئی بات نہیں بتاتی۔" میری نے ہنس کر کہا۔

"بتا روبی۔ تیری فراک کیسی بنی ہے" بملا نے پوچھا۔

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بتا دے نا۔ ہم کوئی چھین تھوڑی لیں گے" انیتا نے مذاق کیا۔

"ابھی میری فراک نہیں بنی" روبی نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں؟ سب نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

"اب کب بنے گی" پرسوں ہی تو بڑا دن ہے" ہے نا ریتا؟ بملا بولی۔

"اور کیا۔" بملا نے جواب دیا۔

جب سب بچوں نے اصرار کیا تو روبی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا "میری فراک نہیں بنے گی۔ پاپا کہہ رہے تھے کہ ان کو ابھی پیسے نہیں ملے۔ میری پچھلے سال کی فراک دھو کر اس پر استری کر دیں گے۔

ہمارے پاپا غریب جو ہیں۔

" چل جھوٹی۔ غریب ہیں۔ انیل تو کہتا ہے تیرے پاپا بہت روپیہ کماتے ہیں۔

" مجھے نہیں معلوم۔ ماما کہتی ہیں کہ ہم لوگ غریب ہیں۔ کسی کے لئے بھی نیا کپڑا نہیں آیا۔

" سچ ؟" شانتی نے تعجب سے دریافت کیا۔

" ہاں میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں شانتی۔" ماما نے کہا ہے بیٹا گھبراؤ نہیں۔

ایسٹر پہ خوب اچھی سی فراک بنوا کر دیں گے۔

روبی نے یہ بات کچھ اس خصوصیت سے کہی کہ سب بچوں کا حیرت سے منہ کھلا رہ گیا۔ ان کے لئے تو یہ بات بالکل عجیب سی تھی کہ تہوار پہ نئے کپڑے نہ بنیں وہ کیا جانیں کہ تہوار کے لئے فکر کرنا بڑوں کا کام ہے اور خوشیاں منانا بچوں کا۔ کوئی روبی کے پاپا کو کنجوس کہہ رہا تھا کوئی لالچی کوئی کچھ کوئی کچھ۔ لیکن مارگریٹ پر جو ان سب میں ذرا بڑی تھی روبی کی باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ وہ سوچنے لگی۔ روبی کے پاپا نے اس کے لئے نئی فراک نہیں بنائی وہ کہتی ہے ان کو کہیں سے پیسے نہیں ملے۔ بڑے دن پر سب بچے نئے نئے کپڑے پہنیں گے اور وہ بیچاری پرانی فراک پہن کر گرجے جائے گی۔ کتنی بری بات ہے۔

وہ گھر جاکر تمام رات یہی سوچتی رہی کہ کس طرح روبی کی مدد کرے کبھی سوچتی کہ اپنی نئی فراکوں میں سے ایک فراک اس کو دے دوں۔ پھر سوچتی کہ ماما سے پیسے مانگ کر اسے دے دوں۔ کبھی خیال کرتی کہ سب

بچوں سے چندہ جمع کروں۔ یونہی سوچتے سوچتے پچیس تاریخ آگئی۔ وہ صبح سویرے اٹھی۔ اپنی فراکوں میں سے ایک خوبصورت فراک نکال کر ماما کے پاس جاکر بولی:۔

"ماما یہ فراک میں لے لوں۔"

"نہیں بٹیا۔ بڑے دن کے لئے تمہارے پاپا نے دوسری فراک بنوائی ہے وہی پہنو۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے ممی۔"

"پھر کیا مطلب ہے تمہارا۔"؟

"یہ فراک مجھے بالکل دیدیجئے۔"

"یہ تمہاری ہی تو ہے۔ دے کیا دوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر......"

"مگر کیا صاف صاف کہو۔ کیا بات ہے؟"

"بتاؤں؟ آپ ناراض تو نہ ہونگی؟

"نہیں بتاؤ۔"

"وہ جو روبی ہے نا ممی بابو مسیح دیال کی لڑکی۔"

"ہاں ہاں۔"

"اس کو بڑے دن پر انعام دوں گی۔ ممی معلوم ہے آپ کو اس کے پاپا کو کہیں سے پیسے نہیں ملے۔ اس لئے اس کے گھر میں بڑے دن کے واسطے کسی کے لئے نئے کپڑے نہیں بنے وہ بیچاری کہہ رہی تھی کہ بڑے دن کو پرانی فراک پہن کر گرجے جائے گی۔ کتنی بُری بات ہے...... میرے پاس تو بہت سی فراکیں ہیں۔ ممی یہ فراک اس کو دے دوں۔ کتنی خوش

ہو گی وہ ۔۔"

مارگریٹ کی یہ رحم دلی اور ہمدردی دیکھ کر اس کی ماما خوشی سے پھولی نہ سمائی ۔ انہوں نے مارگریٹ کو پیار کر کے کہا ۔

"جاؤ بیٹا جو فراک تم دینا چاہو اس کو دے آؤ ۔"

مارگریٹ خوشی سے ناچنے لگی ۔ جلدی جلدی فراک کا بنڈل بنایا ۔ ادھر گرجے کا گھنٹہ بج رہا تھا ادھر مارگریٹ ہاتھ میں بنڈل لئے دوڑی ہوئی روبی کے گھر جا رہی تھی ۔

# اندھیرا

بٹالہ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۵۶ء

میرے اچھے پال!

بٹالہ کی وہ آخری رات تمہیں یاد ہوگی جب ایک خاص مدت تک دور رہنے کے بعد مجھے تمہاری حسین قربت نصیب ہوئی تھی۔ میں پرنم آنکھیں لیئے ہوئے تم سے لپٹ گئی تھی۔ اور تم بھی کچھ افسردہ سے ہوگئے تھے اور میں نے رندھی ہوئی آواز میں تمہیں تمہاری چند ایک حسین غلطیوں کا احساس دلایا تھا۔ تم نے مجھ سے معافی مانگ لی تھی۔ میں شرم سے دوہری ہوگئی تھی۔ تمہاری سب بے اعتنائیاں میں نے بھلادی تھیں۔ اور میں مارے شرم کے کچھ بول نہ سکی اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید قصوروار میں ہی ہوں اور میں نے خود جھک کر تمہارے پاؤں پکڑ لیئے تھے۔ لیکن تم نے مجھے شانوں سے پکڑ کر سہارا دیتے ہوئے کہا تھا۔ "درشنہ کتنی بھولی ہے تو اور کتنی حسین ہے تیری معصومیت......" جب مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے میری آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔

وہ رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن محبت کی کہانی ختم نہ ہوئی،

میں سناتی رہی اور تم سنتے رہے لیکن محبت کے حسین سپنے ادھورے رہے، تم کچھ تھکے ہوئے تھے تمہیں نیند آگئی تھی میں اس وقت تمہارے بھولے اور حسین دامن میں تمہارے عذر جفا کو ذہن میں لیئے نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی لیکن وہ سب کچھ میں نے غلط سوچا تھا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں اداس ہوگئی اور بے چینی کی حالت میں دیر تک جاگتی رہی۔

ایک دفعہ تم نے کہا تھا تمہاری آنکھیں، حتیٰ کہ تم سرتاپا حسین و دلکش ہو......"

پھر تم نے وہ جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں چھوئی موئی کی طرح سکڑ گئی تھی اور پھر تم نے مجھے ٹھوڑی سے پکڑ کر ایک اور سوال دہرایا تھا۔

"درشو کیا ہماری بھی کوئی چیز تمہیں اچھی لگتی ہے......" کیسا عجیب و غریب سوال تھا جس کا جواب میں نہ دے سکی، لیکن جواب بھی میں اس وقت کیا دیتی جبکہ چودھویں کا چاند میرے سامنے موجود تھا، اور وہ تھے میرے دیوتا...... تم!

جی تو چاہتا ہے کہ تمہارے حسین قدموں میں آکر اپنا دم توڑ دوں اور وہ بچپن کے نامکمل ادھورے سپنے، ادھورے نہ رہیں، لیکن تم جانتے ہو سماجی زنجیروں سے جکڑی ہوئی مجبور عورت ہوں جب کبھی بولنے کی خواہش کرتی ہوں زبان بند ہو جاتی ہے، الفاظ گلے میں اٹک کر رہ جاتے ہیں — آنکھوں میں طوفان امڈ آتا ہے، تمام جسم سن ہو جاتا ہے آنکھیں پتھرا جاتی ہیں رونے کو جی چاہتا ہے لیکن جی بھر کر رو بھی نہیں سکتی۔

میرے راجا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، یہ دنیاوی سماج کے ٹھیکیدار ہمیں اس فانی دنیا میں ملنے نہ دیں گے شاید تم بھی میری طرح بہت دکھی ہوگے

خدا سے ہر وقت تمہاری خیریت چاہتی ہوں۔

بہت بہت سلام
تمہاری اپنی
"درشہ"

ڈاکٹر پال نے یہ خط پڑھ کر سر جھکا لیا اور بیتے ہوئے لمحات کو دہرانے لگا اسے زندگی کے سبھی واقعات یاد تو تھے لیکن ذہن میں بے ترتیب اور بکھرے بکھرے سے ــــ وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ چوڑے بازار کے گھنٹہ گھر نے رات کے دس بجا دیے تھے۔ باہر چاروں طرف اندھیرا تھا کیونکہ آج اماوس کی رات تھی۔ شہر کے ٹمٹماتے ہوئے قمقمے اس مہیب اندھیرے کو بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سوچا اکیلے انسان کا دنیا میں زندگی بسر کرنا کتنا مشکل ہے۔ دل بہلانے کے لئے کوئی پاس ہونا چاہیے اسے اس اندھیرے کے فائدے اور نقصان یاد آنے لگے۔ کہ رات کے اندھیرے میں کوئی سایہ نظر نہیں آتا لیکن روشنی کے آنے پہ سامنے آجاتے ہیں اور پھر اس رات کے اندھیرے میں ہی محبت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں، نہ صرف رات کے اندھیرے میں ہی بلکہ وسیع باغوں میں شاندار عمارتوں، گلیوں اور کوچوں میں گاؤں کے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں ــــ اس نے اس فضول سوچ کو جھٹک دیا اور کھڑکی بند کر کے واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ذہن میں الجھے اور بے ترتیب خیالوں کو سلجھانے لگا اس نے درشو کا خط ایک بار پھر اٹھایا چند سطریں پڑھیں اور پھر وہیں رکھ دیا...

اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی ــــ پال نے جلدی سے وہ خط مروڑ کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ باہر

مسٹر گھوش کھڑے تھے۔

" ہیلو۔ مسٹر گھوش۔ مزاج تو اچھے ہیں کیسے تکلیف کی رات کو حضور نے۔۔۔۔۔۔۔"

" ڈاکٹر صاحب! بس ذرا جلدی کیجیے۔ ڈاکٹری کا ضروری سامان لے کر میرے ساتھ چلیے۔ کار باہر کھڑی ہے۔"

" ایسی کون سی جلدی ہے مسٹر گھوش۔"

" ڈاکٹر صاحب کچھ نہ پوچھیے اوشا نے زہر کھالیا۔"

" کون اوشا ۔۔۔؟"

" میری بیوی ڈاکٹر صاحب ۔۔۔"

پال نے جلدی جلدی ضروری سامان لیا اور وہی کپڑے پہنے ہوئے مسٹر گھوش کے ساتھ کار تک چلا گیا۔ گھوش نے کار کا دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر پال پچھلی سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ گھوش کار سٹارٹ کر کے شہر کے خاموش بازاروں میں سے ہوتا ہوا جی ٹی روڈ پہ لے آیا اور پھر چند منٹ کے بعد شہر کے باہر کار جی ٹی روڈ پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ شہر سے مسٹر گھوش کا گاؤں پورے بیس میل دور تھا۔ پاس کے قصبہ میں ایک ڈاکٹر تھا لیکن وہ اتنا سمجھدار نہیں تھا۔ مسٹر گھوش اور پال کالج کے دوست تھے۔ دونوں میڈیکل کالج میں اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ پال محنتی اور ذہین تھا۔ وہ آج ڈاکٹر بن گیا۔ گھوش ایک آوارہ نوجوان تھا اور اس کا شہر کے بڑے بڑے غنڈوں میں شمار ہوتا تھا پھر وہ بعد میں جدا ہو گئے۔ لیکن جب گھوش کو پتا لگا کہ پال ڈاکٹر بن گیا ہے تو وہ اسے مبارکباد دینے آیا تھا اور ایک دو بار اسے گاؤں بھی لے گیا تھا۔ پال نے کہا تھا کہ جب کبھی میری خدمت کی ضرورت ہو مجھے یاد کرنا میں

حاضر ہو جاؤں گا اور شاید اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے گھوش نے رات کو بھی پال کو تکلیف دینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ کار کالی ناگن کی طرح بچھی ہوئی سڑک پر سرپٹ دوڑتی جا رہی تھی اور اس کی تیز روشنی اس کے راستے میں بچھتی جا رہی تھی۔ پال نے دیکھا کہ روشنی ہے لیکن پتنگے نہیں۔ شاید سردی کی وجہ سے ـــــ گھوش نے سلسلہ خیالات توڑتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب آگے آ جائیے ......"

"میں یہیں ٹھیک ہوں گھوش صاحب ......"

پھر خاموشی ہو گئی۔ اور کار کی گھڑگھڑ کے سوائے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

مسٹر گھوش پھر بولے۔

"پال صاحب! تقریباً ایک ہفتہ ہوا ہم ایک شکار لائے تھے۔ ایک نرس ........ اس نے آج شام زہر کھا لیا۔"

پھر گھوش خاموش ہو گیا۔ پال نے بات سن لی تھی، لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اسی طرح سوچ میں ڈوبا رہا۔ وہ سوچنے لگا یہ کیا معاملہ ہے، چلتے وقت گھوش نے کہا تھا کہ اس کی بیوی اوشا نے زہر کھا لیا اور اب اس نرس نے ـــــ وہ خیالات کی شاہراہ پر چلتا ہوا زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کو دیکھنے کے لئے چند منٹ رکا۔ اس کشمکش میں اسے وہ نرس یاد آئی جو اس کی میٹرک تک ہم جماعت تھی اس نے سوچا کہیں وہی نہ ہو ـــــ لیکن نہیں ـــــ وہ تو بہت اونچے کردار کی عورت ہے، وہ دماغ پر زور ڈال کر طالب علمی کا زمانہ دہرانے لگا۔ جب وہ اور درشنا اکٹھے اسکول میں پڑھا کرتے تھے، دونوں نے اکٹھے ہی میٹرک کا امتحان دیا۔ اور پھر کالج چلے گئے

کالج جاتے ہی درشنو کے باپ کو خدا نے اپنے پاس بلالیا، ماں کے لئے بیٹی کا کالج کا سارا خرچ برداشت کرنا مشکل تھا، درشنو کالج کی تعلیم سے محروم رہ گئی وہ نرسنگ ٹریننگ کرنے چلی گئی۔ جدائی کے باوجود بھی پال اور درشنو کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ پال ایک امیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ ذہن اچھا تھا۔ ایف۔ اے میڈیکل پاس کرلیا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا لیکن ابھی اسے میڈیکل کالج میں گئے ایک ہی سال ہوا تھا کہ باپ کی موت ہو گئی۔ باپ کی وفات کے بعد چاروں بھائیوں نے اپنی جائیداد بانٹ لی اور جو پال کے حصہ میں آئی اس کی تعلیم کے باقی چار سالوں کے لئے کافی نہ تھی۔ باپ کی موت کے بعد دو سال تک گزارہ اچھا ہوتا رہا لیکن پھر تنگی کے دن آگئے۔ جب کبھی درشنو اور پال گھر آتے تو ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے۔

درشنو نے کہا۔

"پال فکر نہ کرو۔ میرا نرسنگ کا آخری سال ہے میں نرسنگ کرنے کے بعد تمہاری مدد کرسکوں گی۔"

درشنو نے وعدہ نبھایا۔ کیونکہ عورت محبت ایک بار اور ایک ہی سے کرتی ہے ـــ درشنو نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ پال کی مدد کرکے اُسے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے اور پھر اگر دنیا نے اجازت دی تو وہ زندگی بھر ایک ساتھ چلیں گے، ایک نرس اور ایک ڈاکٹر ساری عمر لوگوں کو زندگی بانٹیں گے لیکن آدمی ہے کہ وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، پال بھی بدل گیا ـــــ

درشنو نے نرسنگ کرلی۔ اس نے پال کو کئی خط لکھے لیکن پال نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بٹالہ سول ہسپتال میں بطور سٹاف نرس کام کرنے لگی اور پال کی تعلیم کے دوران اس کی مدد کرتی رہی، لیکن پال تھا کہ کبھی کبھی شکریہ کا خط لکھ دیا

کرتا جس میں پیار و محبت کی گرمی نام تک کو نہ ہوتی تھی ......... پال ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد بٹالہ گیا۔ وہ ایک رات ورتھو کے ساتھ ہی ٹھہرا، اس نے اسے بتایا کہ وہ یہاں پریکٹس کرنا چاہتا ہے۔ ورتھو نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن وہاں اتنی واقفیت نہ ہونے کے سبب سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور یہ خط اس دو سال پہلے کی ملاقات کو یاد دلاتا تھا۔ پال نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا خط وہیں تھا۔ لیکن گھوش کی وجہ سے نہ نکالا ___

ورتھو نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کر لے اگرچہ وہ غریب ہے لیکن ایک جسم اور اس کے اندر دھڑکتا ہوا محبت سے بھرپور دل سب کچھ اس کی محبت پر قربان کر دے گی، اس نے اپنی طرف سے محبت کی پختہ زمین پر دل کے سچے جذبات سے تصور کا محل تعمیر کیا لیکن اس پگلی نے یہ نہ سوچا کہ دھن دولت کے بغیر سنگلاخ زمین بھی ریتلی بن جاتی ہے اور آنسوؤں کے پانی سے محبت کی بنیادیں پکی نہیں ہوتیں

............ اور پال نے ایک امیرزادی کلبوں اور ہوٹلوں اور تھیٹروں میں ساتھ جانے والی دوشیزہ سے شادی کے انتظام مکمل کر لئے۔ پال کو ضمیر نے آواز دی کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے جو ایک غریب مسیحی نرس کی محبت کو ٹھکرا دیا ہے لیکن ایک دم اس کے ذہن میں آواز گونج اٹھی۔

”عورت کا کوئی دھرم اور مذہب نہیں اور نرس؟ وہ تو کسی بھی غیر مسیحی سے شادی کر سکتی ہے، دنیا کی ہر چیز کی قیمت ہے، خدا کی قیمت ہے، انسان کی قیمت ہے، عورت کی قیمت ہے، نرس کی قیمت ہے، بہت تھوڑی قیمت

دنیا میں ہر ایک چیز خریدی جا سکتی ہے درشو کو خریدنے کے لئے [illegible] بہت ہیں، میں نے ایک قیمتی اور مغربی سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز کا سودا کر لیا ہے۔

..........“

”آئیے ڈاکٹر پال ذرا جلدی اتریے ......“ پال کو یاد بھی نہ رہا کہ گھوش کا گھر آ گیا کار کی گھر گھر بند ہو گئی ہے اور گھوش کار کا دروازہ کھولے کھڑا ہے، پال جلدی سے دوائیوں والا چھوٹا کیس اٹھائے نیچے اتر آیا، نیچے اترتے ہی گھوش نے دوائیوں والا چھوٹا کیس خود پکڑ لیا اور کوٹھی کا دروازہ کھول کر اسے اوپر کی منزل لے گیا چارپائی پر رضائی میں منہ لپیٹے کوئی پڑا تھا، گھوش رکھ کر مریض کے منہ سے رضائی اٹھانے لگا اور پال اپنی جیب میں انجکشن لگانے کیلئے کچھ ڈھونڈنے لگا، لیکن درشو کے خط کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، وہ اسی کشمکش میں اپنا کیس کھولنے لگا کہ گھوش نے کہا۔ ”آئیے ڈاکٹر صاحب اسے دیکھئے یہ کچھ بے ہوش نظر آ رہی ہے۔“ پال خالی سرنج ہاتھ میں لئے اسے دیکھنے کے لئے اس کی طرف لپکا درشو کو دیکھتے ہی خالی سرنج اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گئی پال کو بھی کچھ نہ سوجھ رہا تھا، اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے اس نے جلدی سے کہا۔ ”گھوش صاحب فکر نہ کیجیے ابھی میں دوسری سرنج سے ......“ پال نے مریضہ پر ایک نظر ڈال کر کہا۔ ”گھوش صاحب مریضہ کو ذہنی صدمہ پہنچا ہے آپ ذرا جلدی سے نیچے چلے جائیے میں پندرہ منٹ کے بعد اپنی رپورٹ دوں گا۔“

گھوش صاحب نیچے چلے آئے اور اپنے دفتر میں آ کر انتظار کرنے لگے پال نے دروازہ بند کر لیا۔ پال کے ہاتھ پاؤں اور جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے درشو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”درشو!“

درشو جو پہلے جان بوجھ کر بیہوش ہو گئی تھی۔ تکیے اور پال کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھی۔

" درشو یہ کیا کیا تم نے ۔۔۔؟

" پال یہ بھی اچھا ہوا جو خدا نے آخری بار تم سے ملا دیا خدا سے بھی جا کر تمہاری بابت شکوہ نہیں کروں گی کہ زندگی میں میں نے تمہارے ساتھ چلنے کی کوشش کی تھی لیکن جب تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو مجھے محسوس ہوا کہ بغیر دولت کے محبت وہ نشہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور کشش کی آگ بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے اور انسان کو اس وقت تک ہوش نہیں آتا۔ جب تک وہ خود اس آنچ میں جلنے نہ لگے، زندگی پیار پہ قربان ہو جاتی ہے۔ فطرت زندگی کو اس کی ضرورتوں کے مطابق ہنساتی رلاتی اور زخمی کرتی ہے پال نہ صرف میں زخمی ہوئی بلکہ دوسروں کو زندگی بانٹنے والی نے خود اپنی زندگی کو ختم کر لیا۔ ظالم گھوش کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو کر اسپتال چلا آیا تھا۔ وہاں اس سے میری ملاقات ہوئی۔ تمہارا ذکر چل گیا، اور اچھا ہونے کے بعد یہ ظالم مجھے تمہیں ملانے کے بہانے ایک ہفتہ پہلے یہاں لے آیا اور اپنی من مانی کرنے کے بعد مجھے آگے فروخت کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ عورت بازاری جنس جو ہوئی جب تم نے مجھے نہیں خریدا تو میں کسی اور کے پاس جانا نہیں چاہتی ڈاکٹر ۔۔۔"

" درشو ۔۔۔!! پال بند کمرے میں پورے زور سے چلایا اور اپنے کان بند کر لیے اس نے جلدی سے اپنا دوائیوں والا کیس بند کر کے چلتے ہوئے چیخ کر کہا " اے کمینے گھوش یہ کیا کر دیا تو نے ۔۔۔"

درشو بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ پال کچھ بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے عجلت میں زور سے دروازہ کھولا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر گیلری میں ہوتے ہوئے مسٹر گھوش کے دفتر کے سامنے سے دوڑنے لگا، مسٹر گھوش چلائے۔ "ڈاکٹر صاحب پیسے لیتے جائیے۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

پال کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل، بھاگا اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم ہوگیا۔ گھوش صاحب کو اپنی ٹارچ ڈھونڈھنے میں دیر لگی۔ جب وہ ٹارچ لے کر باہر نکلے۔ پال کافی دور جا چکا تھا۔ انھوں نے پال کو دو تین بار پکارا باہر گلی میں ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔

---

رات کے دو بج چکے تھے گاؤں کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی نے اِکّے دُکّے مسافر لے کر چلنے کے لئے وسل دی۔ پال ابھی تک ہانپ رہا تھا اس نے کھڑکی سے سر نکال کر باہر گاؤں کی طرف دیکھا گاؤں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی ادھر پال کی اپنی آنکھوں کے سامنے بھی گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جس میں نہ کوئی روشنی تھی نہ سایہ —— !!!

# دُوج کا چاند

وہ ایک جنگلی پودا تھا جو برسات کے دنوں میں ایک اجاڑ بیابان میں اگ آیا تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ بھی برسات ختم ہوتے ہی مرجھا کر سوکھ جاتا اور اس کا وہی حشر ہوتا جو برسات ختم ہونے کے بعد دوسرے پودوں کا ہوتا ہے۔ لیکن نہ جانے وہ کتنا سخت جان تھا۔ وہ نہ مرجھایا۔ سخت آندھیوں، طوفان اور چلچلاتی دھوپ میں بڑھتا رہا۔ اس پودے کی سخت جانی دیکھ کر کسی مہربان کے دل میں رحم آیا اس نے پودا وہاں سے اکھاڑ کر کسی خوبصورت باغ میں لگا دیا۔ جہاں اسے ایک کونے میں بچا بچایا پانی مل جاتا۔ وہ پودا بڑھتا گیا اور اس کی جڑیں زمین کے اندر اتنی گہری چلی گئیں کہ اب کسی آندھی طوفان۔ سخت دھوپ اور جاڑے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

یہ پودا راجندر پال تھا۔ جو رام پور کے انجانے سے گاؤں میں شہر سے بہت دور ایک مسیحی گھر میں پیدا ہوا۔ کسی مہربان کی نظر اس غریب بچے پر پڑی۔ وہ اسے اٹھا کر شہر لے گیا۔ راجندر پڑھنے میں ہوشیار تھا۔ لیکن اس کے سب ساتھی اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ خاموش طبیعت تھا۔ اس میں اپنے ساتھیوں ایسی چالاکی و ہوشیاری نہ تھی۔ وہ ان کی طرح گالیاں نہ دے سکتا تھا۔

لیکن وہ محنت کرتا رہا۔ ہائی اسکول میں اچھے نمبر حاصل کرنے کے بعد یونیورسٹی سے وظیفہ حاصل کیا۔ کسی نیک استاد کی صلاح اور مدد سے وہ ایک کالج میں داخل ہو گیا۔ جہاں اس نے اچھے نمبروں پر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے ہمت کر کے ایم۔ اے انگلش میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی میں جاکر اسے ایک نئی دنیا سے دوچار ہونا پڑا۔ جب وہ اپنے ہم جماعت لڑکے اور لڑکیوں کو دیکھتا۔ تو اس کا دل بھی انہی کے سے حالات میں رہنے کو ترس جاتا۔ دوسرے طالب علموں جیسے زرق برق اور قیمتی کپڑوں کیلیے اس کا جی للچا جاتا اور وہ سوچنے لگتا کیا کبھی اس کی بھی کسی لڑکی سے دوستی ہو گی!

آدھی چھٹی یا خالی پیریڈ میں لڑکے لڑکیاں نرم نرم گھاس والے لان میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے۔ وہ پکنکوں کا پروگرام بناتے لیکن اسے اپنے اندر ایک کمی محسوس ہوتی اسے ایسا لگتا جیسے وہ کسی غلط جگہ پر آگیا ہو۔ اسے کسی ایسے کالج میں جانا چاہیے تھا جہاں اس جیسے سیدھے سادھے دبلے پتلے اور سانولے رنگ کے انسان ہوتے جہاں وہ کسی کو دوست بنا سکتا۔ کھلی فضا میں سانس لے سکتا۔ لیکن یہاں تو اس کا دم گھٹتا۔ وہ سوچتا۔ پڑھائی میں ہوشیار ہونا ہی کافی نہیں زندگی میں اور بہت کچھ چاہیے۔ طالب علمی کے زمانہ میں اور خاص طور پر یونیورسٹی میں گرل فرینڈ تو ضرور ہونی چاہیے اور وہ بھی کوئی امیر لڑکی لیکن ......... امیر لڑکی تو کسی امیر لڑکے کی ہی گرل فرینڈ ہو سکتی ہے۔

اسے اس دن کیا ہی اچھا لگا تھا۔ جب ڈراما کا پیریڈ ختم ہونے کے بعد لڑکے لڑکیاں جماعت سے باہر نکلے۔ تو کلثوم ایک لمبی آسمانی رنگ کی

کار کی طرف بڑھی اور ایک دبلے پتلے ساڑھے چھ فٹ لمبے جوان نے کُسم کے لئے کار کی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور وہ بصد ناز، اندر داخل ہوگئی پھر اس کارٹون نے جو بالکل تنگ اور چست کپڑوں میں ملبوس تھا کار کا دروازہ بند کیا۔ پھر اس نے اپنی نظر کی عینک کو سنبھالا اور کار سٹارٹ کردی۔ یہ کُسم کا بوائے فرینڈ تھا۔

کُسم راجندر کو بہت پسند تھی۔ وہ پتلا چھریرا جسم خمیدہ ہونٹوں کا ہلکا گلابی رنگ نشے میں چور بڑی بڑی آنکھیں۔ اُس کے تمتماتے رخساروں پہ شہابی روئیں ...... لیکن کُسم بہت مہنگا شکار تھا اس نے سوچا ع

وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔

کُسم نہ سہی۔ وینا اس سے کم نہیں۔ فرق صرف یہی ہے کہ اس کا رنگ ذرا سانولا ہے۔ اور قد چھوٹا لیکن نقش تو تیکھے ہیں پھر اس کا رجحان وینا کی طرف ہوگیا لیکن وہاں بھی اسے منہ کی کھانی پڑی۔ ریت کا وہ محل جو اس نے اپنے دل میں تعمیر کیا تھا۔ وینا کے ایک ہی طمانچے سے دھڑام سے زمین پر آرہا ...... اس نے سوچا یہ سب کچھ ماڈرن انسانوں کے لیے ہے۔ وہ نہ تو امیر ہے اور نہ ماڈرن ...... اسے اپنے غریب ماں باپ کا احساس ہر وقت ایک بوجھ بن کر ماڈرن بننے سے آگاہ کرتا رہتا۔ اس نے سوچا اگر اس کی یہی حالت رہی تو کوئی بھی لڑکی اس سے شادی نہیں کرے گی اور وہ عمر بھر زندگی کی ویران سنسان راہوں میں اکیلا بھٹکتا رہے گا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ ایم اے پاس کر لینے کے بعد اور وہ ایک کالج میں انگلش کا لیکچرار ہوگیا۔ زندگی کی کشتی ہلکی پھلکی لہروں پہ بہنے لگی۔ لیکن اسکے ہاتھوں کے زخم اور پاؤں کے چھالے ابھی تک تازہ تھے جو جون اور

جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں کھیتوں اور سڑکوں پر کام کرتے رہنے سے اسے ملے تھے اور آج کالج میں پروفیسر ہونا انہی زخموں کا صلہ تھا۔

سیناؔ وہ کلی تھی جس نے سرسبز و شاداب چمن میں بہار کے موسم میں آنکھ کھولی تھی جو عیش و عشرت کے جھولوں میں جھولی تھی گھر میں بڑی ہونے کا شرف بھی اسی کو حاصل تھا۔ ماں باپ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ ہر کام میں اسے پوری آزادی تھی۔ نوکروں کے ہاتھوں میں اس کی پرورش ہوئی باپ ایک ڈاکٹر تھا۔ لیکن مریضوں سے جائز پیسے وصول کرتا اس کا اصول ایمانداری تھا۔ اسی لئے وہ بہت امیر نہیں بن سکا

سینا نے کانونٹ سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ باپ کی اچھی واقفیت تھی اور وہ ایک سچا مسیحی بھی تھا۔ ماں باپ دونوں سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی بچی کو خوب عیش و آرام سے پالا۔ ابھی سینا پانچویں جماعت میں ہی تھی کہ اس کے کتنے ہی بوائے فرینڈ بن گئے جو اس کے گھر جانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس سے دوستی ضرور رکھنا چاہتے تھے۔ راکیش اسے دل سے چاہتا تھا۔ اس کے پاس کار بھی تھی۔ اکٹھے کالج میں داخل ہوئے۔ راکیش کو سینا پسند تھی۔ لیکن محض دوستی کی حد تک۔ بالکل کاغذ کے پھولدار اور خوبصورت گلاس پلیٹوں کی طرح جنہیں کوئی امیر خاندان باہر پکنک پر لے جائے اور استعمال کرنے کے بعد وہیں پھینک دے۔ لیکن مستقل طور پر گھر نہ لائے۔ راکیش کا باپ ایک کٹر غیر مسیحی تھا۔ جو مسیحیت کی نسبت کوئی نیک رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک مسیحی لڑکی کو اپنے گھر لائے سینا نے سوچا شادی نہ سہی راکیش سے

دستی قائم رکھ کر کاروں میں سیر تو کی جا سکتی ہے۔ اس سے پیسہ تو ٹھگا جا سکتا ہے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ یہ کاروں اور پیسوں کے خواب اس کی اپنی زندگی میں کبھی پورے نہ ہونگے اس کا جینا محال ہو جائے گا۔ کاروں اور سکوٹروں کے خوابوں کی تعبیر نہ ہونے پر یہی چیزیں کانٹے بن کر اسکی زندگی کی راہوں پر بکھر جائیں گی اور اسے قدم قدم پر نڈھال کرتی رہیں گی۔

سینا نے ایم اے تو کر لیا لیکن بد قسمتی سے سکنڈ کلاس حاصل نہ کر سکی اس لئے سوچا کوئی بات نہیں تیسرا درجہ ہے تو کیا ہوا ڈیڈی امیر ہیں۔ اچھی واقفیت ہے کسی امیر ڈاکٹر۔ انجینیر یا آئی اے ایس سے شادی ہو جائے گی۔ سلک کی قیمتی ساڑھیاں۔ سونے کے زیورات کام کرنے کے لئے نوکر چاکر ہوں گے۔ ہماری اپنی ایک چھوٹی سی دنیا ہوگی۔ کیا ہی ٹھاٹھ ہوں گے ہمارے ـــــ میں سج دھج کر گھر سے سونے سے لدی ہوئی نکلوں گی۔ ایک خوبصورت لمبا چوڑا سوئی آنکھوں والا گورا چٹا نوجوان مجھے آواز دے گا۔

”سینا ڈارلنگ جلدی، نکلو کلب کا وقت ہو رہا ہے۔ ہمیں پٹرول پمپ سے گاڑی میں تیل بھی ڈلوانا ہے۔۔۔۔۔۔“

اور پھر میں بڑے ناز و ادا سے کہونگی اوہ مائی سویٹ ہنی میں ذرا لپ سٹک ٹھیک کر لوں۔ تم بھی بہت بدھو ڈرائیور ہو یہ تیل ویل پہلے کیوں نہیں ڈلوا لیتے۔۔۔۔۔“ اور پھر ہنس دیا کروں گی۔ وینا بھی تو کہہ رہی تھی کہ وہ اپنے پتی دیو کو بدھو کیا الو تک کہہ دیتی ہے۔۔۔۔۔۔“ اور ۔۔۔۔۔“ اور پھر اس کی ماں نے سینا کو اس گہری نیند سے جگا دیا اور وہ حسین سلسلۂ خواب ٹوٹ گیا۔

”بیٹی تمہارے ڈیڈی نے رامپور کے پادری صاحب کو تمہارے بارے میں ایک خط لکھا تھا اسکا جواب آ گیا۔

”میرے بارے میں۔ اور رام پور کے پادری صاحب کو؟ کیا لکھا تھا ممی بتاؤ۔ بتاؤ نا ممی ......“

”بیٹی یہی تمہاری شادی کیلیے ......

ممی! کیا لکھا تھا اور کیا جواب آیا —؟“

”بیٹی یہ لکھا تھا کہ میری بیٹی کے لئے ایک اچھے خوبصورت سمجھدار ۲۵-۲۶ سالہ خداپرست نوجوان کی ضرورت ہے۔ جو ڈاکٹر۔ انجنیئر۔ آئی اے ایس یا پی سی ایس ہو —“

”تو ممی کیا انہیں کوئی لڑکا مل گیا —“

”ہاں بیٹی ......“

”ہائے ممی ...... آپ اور ڈیڈی کتنے اچھے ہیں ........“

”بیٹا۔ لڑکا تو مل گیا لیکن ڈاکٹر۔ انجنیئر۔ آئی اے ایس وغیرہ کچھ بھی نہیں ......“

”تو پھر کیا چیز ہے وہ؟ ......“

”وہ انگلش کا پروفیسر ہے اس نے فرسٹ ڈویژن میں ایم اے کیا ہے۔ ابھی چند ماہ ہوئے۔ اس نے نوکری شروع کی۔ رنگ اسکا ذرا سانولا ہے۔ ہم نے پادری صاحب کو لکھا ہے کہ اگلے اتوار وہ لڑکے اور اس کے باپ کو لے کر یہاں آئیں ......“

---

رات کو جب سپنا سونے لگی۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا تعمیر کیا ہوا خوابوں کا محل آندھی کے پہلے ہی جھونکے سے سمار ہو گیا ہو۔ لیکن پھر ایک دم اس کے ذہن کے پردے پر باری باری ان جوان پروفیسروں کی تصویریں

ابھرنے لگیں جو اسے طالب علمی کے زمانے میں پڑھاتے رہے تھے اس نے سوچا مسٹر وجے ورما بھی تو کتنا امیر تھا۔ اس کے پاس ایک خوبصورت سکوٹر تھا وہ ہر روز نئے نئے کپڑے بدل کر آتا تھا۔ اس کی بیوی کے پاس کتنی قیمتی ساڑھیاں تھیں اور پھر بینک بیلنس بھی کتنا تھا۔ اور پھر پروفیسر سودیش بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ وہ بھی بہت خوبصورت تھا اور کار خریدنے کی سوچ رہا تھا۔ اور یہ بھی پروفیسر ہے نہ ہو سکتا ہے یہ بھی ویسا ہو۔ اگر سکوٹر نہ ہو گا تو بینک بیلنس تو ہو گا۔ کچھ اور پیسے جمع کر کے ہم کار نہ سہی سکوٹر ہی لے لیں گے —— بٹنا سو روپیہ کا ایک آدھ نوٹ ہر وقت میرے پرس میں رہے گا —— اور پھر سوچتے سوچتے اسے نہ جانے کب نیند آ گئی اور وہ میٹھے اور حسین خوابوں میں کھو گئی۔

اگلے اتوار پادری صاحب پروفیسر راجندر پال اور اسکے باپ کو لیکر آ گئے۔ راجندر اور سپنا نے غور سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سپنا نے سوچا یہ دبلا پتلا درمیانے قد کا سانولا نوجوان اس کے سپنوں کا شہزادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں آیا کہ وہ ایک دم انکار کر دے۔ پھر اس نے نہایت سنجیدگی سے سوچا کہ قد زیادہ لمبا نہیں تو کوئی بات نہیں اس کے اپنے قد سے تو لمبا ہے اگر گورا چٹا نہیں تو اتنا سانولا بھی نہیں۔ دبلا پتلا ہے تو صحت اچھی ہو جائے گی لیکن بینک بیلنس تو ہو گا ہی۔ پروفیسر جو ٹھہرا۔ عیش و آرام سے زندگی تو کٹ سکے گی۔ اور پھر اس نے رشتہ قبول کر لیا۔ جب راجندر کو معلوم ہوا کہ اسے پسند کر لیا گیا ہے۔ اور وہ کسی کے سپنوں کا شہزادہ بنے گا۔ اس کی زندگی میں بھی ایک خوبصورت نازک اندام اور سرخ ہونٹوں والی حسینہ داخل ہو جائے گی تو اسے یقین نہ آیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سپنا کو ہر قیمت پر خوش رکھے گا۔ وہ

اس کی راہوں کے کانٹے اپنی پلکوں سے چن لے گا ........

چند ماہ بعد دونوں کی شادی ہو گئی راجندر کو یوں محسوس ہوا جیسے سپنا ایک پورنماشی کا چاند بن کر اس کی زندگی میں سما گئی ہو۔ اور اس کی زندگی کا ہر گوشہ روشن ہو گیا ہو...... وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ راجندر سپنا کو اپنی زندگی کے گزرے واقعات سنا سنا کر ہر طرح سے خوش رکھتا۔ اسے ہنساتا رہتا اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔ جو بھی پیریڈ خالی ہوتا اس میں گھر آجاتا سپنا بھی راجندر کی زندگی میں سماتی چلی گئی ...... راجندر کی صحت اچھی ہونے لگی چند ہی ماہ میں چہرے کا رنگ نکھر آیا۔ پچکے ہوئے گال بھر گئے ........ اس کی صحت دیکھ کر ایک دن کسی دوست نے کہا تھا " راجندر کس چکی کا آٹا کھاتے ہو آج کل ......" اس نے صرف یہی کہا تھا " آج کل میں خوش ہوں اور گھر کی روٹی کھاتا ہوں ......"

دن گزرتے گئے۔ سپنا بھی خوش تھی اسے پیار و محبت کا وہ خزانہ مل گیا تھا۔ جس کی تمنا ہر عورت کرتی ہے۔

شام کو فرصت کے لمحات کسی باغ یا پارک میں گزرتے وہ ایک دوسرے کو محبت کی کہانیاں سناتے رہتے۔ لیکن وہ کہانیاں ختم نہ ہوتیں گھر آکر بھی رات گئے تک جاگتے رہتے ........ " سپنا میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی پیاری اور خوبصورت بیوی ملی ہے۔"

" میں بھی راجہ ......"

" سچ کہتی ہو سپنا۔"

راجندر نے حیرانی سے پوچھا جیسے اسے ان الفاظ پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"سچ سپنا!"

"ہوں۔"

ایک سہانی شام تھی جب وہ باہر سیر کو جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ کہ اچانک پروفیسر پرس رام اپنی نئی نویلی دلہن کو سکوٹر پر بٹھائے ہوئے ان سے ملنے آگئے۔ وہ مسٹر راجندر کے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے ان کی شادی ایک مشہور سیٹھ گوجر مل کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ لڑکی جہیز میں سونے کے زیورات کے علاوہ فریج اور سکوٹر بھی لائی تھی سپنا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آخری میک اپ کر رہی تھی۔ کہ راجندر کی آواز آئی۔

"سپنا ادھر آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے......"

سپنا آگئی ان دونوں میاں بیوی نے ہاتھ جوڑ کر آداب عرض کیا۔ سپنا کے ہاتھ خود بخود طرح اٹھ گئے۔ "سپنا یہ ہیں میرے عزیز دوست پروفیسر پرس رام یہ فلسفے کے لیکچرار ہیں اور یہ ہیں ان کی مسز......"

"کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟" — سپنا نے مسز پرس رام کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"نوازش ہے......" مسز پرس رام مسکرائی "ایسا لگتا ہے آپ کہیں جانے کے لئے تیار ہیں —"

نہیں — بس یہی نہرو پارک تک — آج شام سہانی ہے نا —"

"پھر تو ہم نے آکر اچھا نہیں کیا —"

"نہیں۔ کوئی بات نہیں مسٹر پرس رام۔" راجندر نے کہا "آپ بیٹھیے یہ بھی کوئی بات ہے بھلا؟......"

"ہم تیار تو کافی دیر سے تھے۔ لیکن مین موقع پر مستری فریج ٹھیک کرنے آ گیا اس میں ذرا سو نیا پائپ لیک کرتا تھا۔ بس دیر ہو گئی ........" یہ مسز پریس رام کی آواز تھی۔ پھر آدھ گھنٹے تک کافی کا دور چلتا رہا۔ پروفیسر پریس رام اور ان کی بیوی نے اجازت مانگی اور چلنے کے لئے اٹھے۔ راجندر اور سپنا انہیں دروازے تک چھوڑنے گئے۔ سپنا نے دیکھا باہر ایک بالکل نیا خوبصورت ہلکے نیلے رنگ کا سکوٹر کھڑا ہے۔

انہوں نے ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔

مسٹر پریس نے سکوٹر سٹارٹ کیا۔ مسز پریس رام ریشمی ساڑھی کو سنبھا ہوئی پیچھے بیٹھ گئی اور وہ چلے گئے۔

کافی دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد سکوٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا...... اور صرف دھول اور گرد و غبار رہ گیا۔

سپنا ایک اداس اور بوجھل دل کے ساتھ واپس مڑی اس نے دیکھا کہ راجندر کچھ دیر پہلے اندر جا چکا ہے..... اور کافی کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ رہا ہے۔

راجندر نے برتن اندر رکھ لینے کے بعد سپنا سے کہا" چلو سپنا اب تھوڑی دیر گھوم آئیں۔

"راجندر! میرا دل نہیں کرتا۔ سیر کو جانے کے لئے۔"

"کیوں ۔۔ ؟"

"بس یونہی.... میرا سر چکرا رہا ہے ۔۔"

"اچھا چلو.... ہم اس سے بھی راضی ہیں یہ کہ تیری رضا ہے ۔۔" اور

پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"راجندر یہ اسکوٹر انھوں نے کب لیا۔؟"

سپنا یہ سکوٹر اور فریج انکو جہیز میں ملا ہے اور ساتھ ہی یہ میٹرک فیل بیوی۔" سکوٹر کا رنگ کتنا اچھا ہے ...... مجھے یہ رنگ بہت پسند ہے .... اور پھر دیکھو وہ پیچھے بیٹھی کتنی بھلی لگ رہی تھی ـــ"

"ہاں سپنا ـــ"

پھر سپنا خاموش ہو گئی ..... "راجندر میں سونے جا رہی ہوں۔ میرا سر چکرا رہا ہے" سپنا چلی گئی اور اپنے بستر پر دراز ہو گئی ..... سپنا کو محسوس ہوا جیسے اس کے زخم ہرے ہو گئے ہوں، اس کے دل کے اندر دبی ہوئی آگ پھر سلگ اٹھی ہو۔ اور یہ سہانی شام ایک کرب اور دکھ بن کر اس کے دل میں گھر کر گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ مسز پریم رام سے بہت چھوٹی ہے ..... اتنی پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بھی اس کی وقعت مسز پریم رام کے مقابلہ میں کچھ نہیں تھی .... کم مائیگی کا احساس اس کے اندر بڑھنے لگا۔ راجندر نے ایک دو بار بلایا بھی، لیکن وہ چپ چاپ پڑی رہی، راجندر نے سوچا اب سپنا سو چکی ہے۔ اسے تنگ کرنا اچھا نہیں ـــ صبح وہ حسب معمول اٹھا، اس نے انگیٹھی سلگائی ..... اور پھر سپنا کو جگایا۔ "سپنا کہو کیسی طبیعت ہے؟"

"اچھی ہے، ٹھیک ہو جائے گی ـــ!"

"یہ کیا بات ہوئی، اچھی ہے ٹھیک ہو جائے گی ـــ"

راجندر ہنس پڑا۔ "کہو تو سر دبا دوں"

"نہیں کوئی بات نہیں۔"

راجندر نے خود ہی چائے بنائی اور کچھ ٹوسٹ کھا کر کالج چلا گیا......

بعد میں سپنا اٹھی۔ اس نے سوچا "یہ بھی کیا بے وقوفی ہے میں بلا وجہ منہ پھلائے پڑی ہوں"۔۔۔۔ اس نے غصہ تھوک دیا اور نہا دھو کر تیار ہو گئی، وقفہ کے دوران راجندر اسکول سے سپنا کو دیکھنے آیا۔ اس نے دیکھا۔۔۔۔ سپنا حسب معمول تیار ہے اور خوش پھر رہی ہے۔"

"سپنا تم ٹھیک ہو گئیں۔"

"ہاں راجو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے خواہ مخواہ تمہیں پریشان کیا۔"

"کوئی بات نہیں سپنا۔"

اور پھر وہ خوشی خوشی کھانا کھا کر چلا گیا۔

شام کو وہ دونوں سیر کرنے چلے گئے۔

نہرو پارک کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے سپنا نے کہا۔

"راجندر ہماری شادی کو آج چھ ماہ ہو گئے۔"

"ہاں سپنا۔"

"دن کتنے حسین اور پیارے گزر رہے ہیں یہ۔"

"تمہاری وجہ سے، ورنہ بندہ کسی تعریف کے قابل نہیں۔"

"راجندر ایک بات پوچھوں۔ اگر برا نہ مانو؟"

"سپنا پوچھو۔۔۔۔ تمہیں پورا حق ہے۔۔۔۔ غلام اس کا جواب دیگا۔!"

"راجندر۔ ہمارے پاس بنک میں کتنا پیسہ ہوگا۔"

"یہی کوئی پچاس روپے، وہ بھی بس ایک بار سٹیٹ بنک میں اکاؤنٹ کھلوایا تھا۔ پھر کوئی پیسہ جمع نہیں کر سکا۔۔۔۔ تمہیں تو پتا ہے حالات کیسے ہیں۔۔۔۔ اور زمانہ کیسا مہنگائی کا ہے۔۔۔۔ ہر ماہ چار سو روپیہ ملتا ہے لا کر تمہیں دے دیتا ہوں۔۔۔۔ گھر میں ہی خرچ ہوتے ہیں۔۔۔۔ آج کل بچتا ہی کیا ہے۔۔۔۔ کچھ

تمہیں ضرورت ہے..... بتاؤ ضرورت ہے تو ہم کسی سے ادھار لے لیں گے..... مجھے کوئی انکار نہیں کرے گا۔ پھر آہستہ آہستہ اتار دیں گے۔"

راجندر کو ایک دم شک گزرا کہ آج ضرور کچھ بات ہے۔ وہ پھر صفائی پیش کرنے لگا۔

"سینا پروفیسر یا لیکچرار ایک اُستاد ہی تو ٹھہرا، ہمارے ملک میں استاد کی وہ عزت نہیں..... وہ تنخواہ نہیں جو آئی، اے ایس ڈاکٹر یا انجینیر کی ہے۔ اس بیچارے کو ان کی طرح اوپر سے کچھ آمدنی نہیں..... اگر تمہیں ضرورت ہو تو کہو..... کتنے پیسے چاہئیں۔" سینا ایک دم خاموش ہو گئی..... اس کے خوابوں کا محل گر گیا..... وہ اسکوٹر اور وہ دھول اڑاتی ہوئی کاریں..... سینا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں..... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا..... جس میں نہ بینک بیلنس کی پاس بک..... نہ سکوٹر..... نہ کار..... نہ فریج..... نہ نوکر..... اور نہ ہی شاندار کوٹھی، اور نہ ہی وہ پرس جس میں سو سو کے نوٹ ہوں..... اسے ان میں سے کوئی چیز بھی نظر نہ آتی تھی.......

وہ لوگ سارا راستہ بغیر بات کیے چلتے رہے..... سینا کے لئے وہی راستہ اب دس گنا لمبا ہو گیا تھا..... گھر پہنچ کر وہ خاموش اپنے بستر میں جا کر گھس گئی، راجندر کے بلانے پر بھی وہ نہیں بولی۔

"سینا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" راجندر اس بے رخی کو بھانپ گیا..... اگلے روز صبح وہ خود ہی اٹھا..... چائے بنا کر پی اور کالج چلا گیا۔

اس نے سوچا خود بخود ٹھیک ہو جائے گی..... لیکن راجندر کو کیا پتا تھا کہ وہ پورنماشی کا چاند جو بلندیوں پر چمک رہا تھا اب ڈھلنا شروع ہو گیا ہے۔

...... کاروں، سکوٹروں، اور بے شمار نوٹوں کے خواب اب کانٹے بن کر سپنا کی زندگی میں چبھ رہے ہیں...... اب اس کی راہوں میں کانٹے بکھر گئے ہیں، اور ان کو چننا راجندر کے بس کی بات نہیں، راجندر نے اپنے منہ کو سی لیا...... زبان کو لگام دے دی اب سپنا راجندر سے چھوٹی چھوٹی بات پر چڑنے لگی۔ اسے ذرا ذرا سی بات پر کوسنے لگی، شام کی باقاعدہ سیر ترک ہوگئی...... اکٹھے بازار جانا اور گھومنا پھرنا بند ہوگیا...... سپنا نے اپنے نہانے دھونے اور کپڑوں کی طرف سے لاپرواہی برتنی شروع کردی۔ سپنا کا رنگ و روپ بگڑنے لگا، کئی کئی دن ایک ہی سوٹ میں گزرنے لگے۔

”سپنا تم یہ کیا بنی رہتی ہو، ذرا نہا دھو کر پہلے کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر رہا کرو۔“

”تم کون ہوتے ہو مجھے نصیحت کرنے والے، کون سے خالص ریشمی سوٹ اور ساڑھیاں لے کر تم نے مجھے دیئے ہیں۔“

”سپنا کیا میں تمہارا شوہر نہیں...... کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں تمہیں اچھی بات کے لئے نصیحت کرسکوں۔ تم مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر چڑتی اور جھگڑتی ہو...... مجھے بیوقوف سمجھ کر الٹا مجھے کوستی ہو، کیا بیسویں صدی میں شوہر اور بیوی کے الفاظ کا مطلب الٹ ہوگیا...... تم عورتوں کی نظر میں مرد ایک بے وقوفی اور مروت کا ملا جلا مجسمہ ہے، اور جس طرف تم چاہو اس کو محبت کی لگام سے گھما سکتی ہو۔ لیکن اس بات سے بے خبر ہو کہ وہ تمہیں نازک ظرف جان کر تمہاری قدر کرتا ہے۔ تمہیں نہ صرف برابر کے حقوق ہی دیتا ہے بلکہ ہر کام میں ترجیح دیتا ہے، گاڑیوں اور بسوں میں تمہارے لئے جگہ چھوڑ کر خود کھڑا ہوجاتا ہے، نوکری کے وقت تم آدمی کے حقوق جھپٹ لیتی ہو——

"سپنا میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ میں غریب ہوں.... میرے پاس صرف محبت کی دولت ہے.... یہی میراث ہے میری.... اور کچھ نہیں.... تم اگر غلطی سے اس گھر میں آگئی ہو تو میں تمہارے راستہ سے ہٹ جاتا ہوں، اور تم وہ راستہ اختیار کرسکتی ہو جس کے اختتام پر خوشیوں، دولت اور پیار کی منزل تمہارا انتظار کررہی ہے، راجندر کبھی بھی تمہارے راستے کا پتھر نہیں بنے گا۔ اگر غلطی سے تمہارے راستے میں یہ آپڑا ہے تو اسے ایک ہی ٹھوکر سے اڑادو...." راجندر نے سوچا تھا کہ یہ الفاظ سپنا کا دماغ ٹھیک کردیں گے، حالانکہ یہ الفاظ راجندر کے دل سے نہیں بلکہ صرف زبان سے نکلے تھے، وہ ان سب باتوں کے باوجود سپنا کو دل کی گہرائیوں سے پیار کرتا تھا۔ اس نے چند روز کے بعد پھر جرأت کی۔

"سپنا اکتوبر کی آج ۱۵ تاریخ ہوگئی، میرے پاس کوئی گرم سوئٹر نہیں ہے..... اگر میں اون لا دوں تو کیا بن دوگی ——؟"

"میرے پاس وقت نہیں..... بازار سے ریڈی میڈ لے لو۔"

"چلو اچھا کوئی بات نہیں..... لیکن سوئٹر یا کوئی جرزی تمہارے پاس بھی نہیں کہو تو تمہارے لئے بھی ریڈی میڈ ہی لے لوں ——"

"نہیں..... مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ گھر نہیں جہنم ہے۔"

"جہنم ——؟"

"ہاں، جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔ میں اس گھر میں نوکر بن کر آئی، اپنے باپ کے گھر میں کوئی پکچر نہ چھوڑتی تھی..... یہاں آکر وہ دل بہلانے کا ذریعہ بھی ختم ہوگیا۔ رنگ وروپ میرا اجڑ گیا۔ اس گھر میں آکر..... یہ گھر نہیں یہ جہنم ہے جہنم....."

لیکن راجندر مصلحتاً لاجواب ہوکر رہ گیا وہ خاموش تھا وہ محسوس کررہا تھا

کہ چاند بہت تیزی سے ڈھل رہا ہے۔

"میں اب اس گھر میں نہیں رہوں گی...... نہیں رہوں گی۔ نہیں رہوں گی ...... میں کل ہی مائیکے چلی جاؤں گی۔ کل صبح میرے لئے تانگے کا انتظام کر دینا۔" راجندر چپ تھا، اسے پتا تھا کہ یہ طوفان ریت کی دیواروں سے نہیں رکے گا، اسے روکنے کیلیے سونے چاندی کے سکوں کی دیوار، موٹر کاروں کی اور بنگلوں کی چمک دمک چاہیے...... اس نے طوفان کو راستہ دے دیا، تاکہ بغیر کسی کو نقصان پہنچائے یہ گزر جائے۔

اگلی صبح راجندر تانگہ لے آیا...... اور سپنا کچھ کپڑے اٹیچی کیس میں رکھ کر مائیکے چلی گئی...... راجندر نے سوچا عورت آدمی کی کتنی زبردست کمزوری ہے دنیا کتنی اچھی تھی جس نے ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کر کے مجھے سیدھا راستہ دکھایا تھا کہ عشق و شادی کرنا بچوں کا کھیل نہیں...... اور میں بھی دھوکا کھا گیا اور وہ پورنماشی کا چاند ڈھل گیا...... سپنا نے جا کر کوئی خط نہیں لکھا۔ اس نے گھر جا کر دھڑا دھڑ دس بارہ فلمیں دیکھ ڈالیں...... کلبوں میں جانے لگی اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ فضا کتنی کشادہ اور صحت بخش ہے، وہاں کتنی گھٹی گھٹی فضا تھی

"ممی میں وہاں نہیں رہوں گی، یہاں رہ کر کسی اسکول میں کام کروں گی۔"

"بیٹا ہم اجازت تو نہیں دیتے لیکن تم دونوں اپنا فائدہ سوچو—!"

"ممی میں اس جہنم کی فضا میں مر جاؤں گی — مر جاؤں گی۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں...... لیکن تم ہو کہ مجھے مارنے پر تلے ہوئے ہو—!"

"پھر سپنا نے وہیں اسکول میں انتظام کر لیا، وہ نومبر کے پہلے ہفتہ میں واپس راجندر کے پاس آئی...... راجندر اس کو یوں اچانک دیکھ کر حیران ہو گیا۔ "سپنا تم کب آئیں ؟"

"کیوں تمہیں کچھ اعتراض ہے؟"

"نہیں سپنا تمہارا یہاں آنا میری خوش قسمتی ہے۔"

"لیکن میری بدقسمتی ہے۔"

"سپنا! میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"تم جواب بھی کیا دے سکتے ہو ——!!"

اور پھر سپنا... اپنے سبھی زیور، اور باقی ماندہ کپڑے سمیٹ کر چلی گئی...

راجندر اکیلا رہ گیا۔ اس نے پھر ہوٹلوں میں کھانا شروع کر دیا۔ اس کی صحت پھر گرنے لگی...... سردی بہت بڑھ چکی تھی...... سپنا کی کوئی خبر نہیں آئی... راجندر کے لئے جینا مشکل ہو گیا جیسے ایک بلند عمارت سے اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا گیا ہو، اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو گئی ہوں، اور اس کا بچنا مشکل ہو۔

۱۸ ر دسمبر کی رات وہ اپنے ہوٹل سے کھانا کھا کر آیا کہ اچانک اسے قے شروع ہو گئی.... اور اس نے شدت کی سردی محسوس کی۔ اس نے دوائی وغیرہ لی کئی دن گزر گئے..... لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، راجندر بستر سے اٹھ نہیں سکا۔ مرض بڑھتا گیا.... ماں باپ کو خبر دی گئی..... وہ آ گئے...... ڈاکٹر کو بلوایا گیا...... تشخیص کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ انہیں نمونیہ ہو چکا ہے، اور یہ آخری اسٹیج ہے دوا سے شاید ہی بچ سکے، لیکن دعا بچا سکتی ہے۔

۲۴ ر دسمبر کی صبح تھی...... راجندر نے سوچا اب وہ بچ نہیں سکتا اور آج کی رات اماوس کی رات ہوگی —— جب میری دنیا اور اس کا چاند ہمیشہ کیلیے ختم ہو جائیں گے..... راجندر کے دوستوں میں سے کسی نے بغیر راجندر کو بتائے ایک تار سپنا کو دے دیا۔

"سپنا —— تمہارا راجندر..... تمہارا سرتاج اور دیوتا......"

آخری سانسیں لے رہا ہے..... ملنا چاہو تو آجاؤ......"

سپنا کو یہ تار ملا، اس نے پڑھا۔

اس نے یوں محسوس کیا جیسے کسی نے زناٹے دار طمانچہ اس کے منہ پہ دے مارا ہو۔

"راجندر میرا سرتاج...... میرا دیوتا..... نہیں..... نہیں نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا....."

وہ پھر سوچ میں پڑ گئی..... پھر تار کو پڑھا۔

"وہ آخری سانسیں لے رہا ہے۔ یعنی راجندر مر رہا ہے"

سپنا کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دوسرا زناٹے دار طمانچہ اس کے رخسار پر پڑا ہو...... اس کا ضمیر اس پر لعنت بھیج رہا ہو۔ وہ ایک دم چلا اٹھی...... "میں جاؤں گی.... ہاں راجندر میرا سرتاج ہے..... میرا دیوتا ہے ـــ" اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا..... اور ماں باپ کو راجندر کی حالت کے بارے میں بتا کر ایک دم شہر کا رخ کیا۔ شام کے سائے ڈھل چکے تھے، سب پرندے دور دراز گھومنے کے بعد واپس اپنے آستانوں کو جا رہے تھے، ڈاک گاڑی سے اترنے کے بعد اس نے تانگہ لیا اور تانگے والے کو ہدایت کی کہ جلدی سے لے چلو جونہی تانگہ گھر کے باہر رکا سب لوگ ایک طرف ہو گئے...... سپنا نے دیکھا سب مذاہب کے لوگ راجندر کی زندگی کی بھیک خدا سے مانگ رہے تھے..... سپنا کا دل پسیج گیا۔ طرح طرح کی آوازیں اس کے کان میں آنے لگیں۔

"بی بی جی۔ بابو جی فرشتہ ہیں فرشتہ۔ بیچارے بہت بیمار ہو گئے آپ کے جانے کے بعد، خدا انہیں نئی زندگی عنایت کرے۔

"ہم غریب لوگن کے لیے تو بابوجی بھگوان کا روپ ہیں..... بھگوان بابوجی کو بچالے۔"

سینا اندر چلی گئی

سب ایک دم کھڑے ہو گئے۔

"بیٹی تم آگئیں..... اچھا ہوا خدا سے دعا کرو کہ وہ تمہارے سرتاج کو بچالے۔"

یہ راجندر کی ماں کی آواز تھی۔

سینا وہیں دعا میں جھک گئی۔ آس پاس کھڑے سب لوگ دعا میں جھک گئے خدا نے سب کی فریاد سن لی، راجندر نے پکارا۔ "پانی۔!"

سینا نے پاس پڑا نیم گرم پانی اس کے منہ سے لگا دیا..... سب کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور یہ بات بھیڑ میں آہستہ آہستہ باہر تک پہونچ گئی۔ — بابوجی بچ گئے..... پروفیسر صاحب بچ گئے

یہ ۲۴؍ دسمبر کی رات تھی..... اس رات چاند نہیں نکلا۔ کیونکہ وہ اماوس کی رات تھی..... لیکن چرنی میں وہ صبح کا ستارہ چمکا جس سے ساری دنیا روشن ہو گئی..... آنے والی سب پشتیں روشن ہو گئیں..... راجندر ساری رات بے ہوش رہا ۲۵؍ دسمبر کی صبح سب مسیحی اور غیر مسیحی بڑے دن کی مبارک باد دے کر چلے گئے کیونکہ راجندر ابھی تک بے ہوش تھا سینا دن رات بغیر کچھ کھائے اس کے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی آخر ۲۶؍ دسمبر کی شام اسے ہوش آیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔

اور پہلے سینا کو دیکھا —

"سینا تم آگئیں؟"

”ہاں راجو..... میں آگئی اب میں کبھی نہیں جاؤنگی ۔“

”کیا اماوس کی رات نکل گئی ــــ“

”ہاں راجو..... آج تو دوج کا چاند نکلا ہوا ہے وہ کھڑکی میں سے باہر دیکھو...... وہ اماوس کی رات میری زندگی میں ایک نئی رات بن گئی جب خداوند یسوع نے صبح کا ستارہ بن کر میری زندگی میں جنم لیا۔“

”سچ کہتی ہو سپنا ۔“

”ہاں راجہ ــــ“

اور پھر راجو نے سپنا کے نرم و نازک ہاتھ اپنے زرد اور خشک ہونٹوں سے لگا لیے۔

# زرد گلاب

کمرے کی خاموشی میں عجیب قسم کی اداسی رچی ہوئی تھی .......
جوزف میرا کالج کا پرانا ساتھی تھا۔ ہر وقت بات بات پر قہقہے لگانے والا جوزف افسردہ اور خاموش تھا اور اس کے چہرے پر گہری اداسی اور پژمردگی چھائی ہوئی تھی شام کے کھانے کے بعد میں نے جوزف کو ٹوکا... "جوزف کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو! جوزف کے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ دوڑ گئی..... اور وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا..... اس کی سیاہ اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

جوزف ایک بڑی کلیسیا کا پاسبان تھا۔ نہ جانے وہ پاسبان کیسے بن گیا، جب وہ زیر تعلیم تھا۔ تو اس نے کبھی بھی ایسا خیال ظاہر نہ کیا تھا مگر اس وقت وہ نہایت ہر دلعزیز اور کامیاب پاسبان تھا کلیسیا کے لوگوں نے کبھی اس بات کا تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ ان کے خوش مزاج اور ہر وقت مسکراتے رہنے والے پاسبان کی زندگی کا دوسرا رخ بڑا ہی دردناک ہے چہرہ پورے وقت مسکراتا ہے اور دل خون کے

آنسو روتا ہے، میں نے جوزف کے بالکل قریب آکر کہا ”میں تمہارا بچپن کا ساتھی ہوں اور ہم نے اپنی زندگی کی کئی خوشحال منزلیں ایک ساتھ طے کی ہیں، کیا تمہاری زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہے جو مجھ سے پوشیدہ ہے، ایسا کون سا راز ہے جو تم مجھ سے چھپانا چاہتے ہو۔ کیا تم مجھ پر بھروسہ نہیں کرتے،، تمہارے پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تم دکھی ہو، ناخوش ہو خدارا مجھے بتا دو تمہارے لئے جو کچھ بھی ہو گا میں کرنے کو تیار ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارا ساتھی ہوں میں تمہیں شالی کا واسطہ دیتا ہوں جس کو تم سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہو میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے تمہاری اداسی نہیں دیکھی جاتی۔ تمہاری خاموشی مجھے مارے ڈالتی ہے۔ شالی کا خیال کرو وہ تم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ وہ تمہاری یہ حالت دیکھے گی تو کیا کہے گی۔“

”بس کرو...... خدا کے واسطے بس کرو۔“...... جوزف جیسے سخت تکلیف سے کراہ اٹھا...... ”میرے سامنے کسی کا نام مت لو۔“ ...... میں نے شالی کو نہیں چاہا...... اور نہ چاہ سکتا ہوں۔ میں ورشا سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا........ ورشا نے مجھ سے حقیقی محبت کی تھی مگر وہ محبت کی اس بلندی تک پہنچ گئی جہاں میں کبھی نہ پہنچ سکونگا۔ مگر تم ورشا کو کیا جانو۔ کہ وہ کون تھی اور کہاں چلی گئی؟ دکڑ! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ شادی سے پہلے کے تین برسوں میں میری زندگی کے دن کتنے پُربہار تھے...... ان دنوں میں بیمار تھا اور ایک پہاڑی علاقے کے ہسپتال میں داخل تھا۔ جہاں

ورشا ایک نرس تھی، وہ ورشا جس کے لئے میں سوچتا تھا وہ ایک مغرور اور بدمزاج لڑکی ہے...... محبت کرنا تو درکنار وہ محبت کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتی ہوگی..... مگر اس ورشا نے مجھ سے بے انتہا محبت کی...... زندگی سے بھرپور محبت...... شبنم سے زیادہ پاکیزہ اور کلیوں سے زیادہ معصوم محبت...... اس بدنصیب لڑکی نے مجھ سے محبت کی تھی لیکن میں بدنصیب تھا میں نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور فرض کو اپنایا..... میں نے اپنے لئے خوبصورت حسین وادیوں کا راستہ چنا تھا جہاں جگہ جگہ خوبصورت پھول مسکراتے تھے....... مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا راستہ ان حسین اور دلکش وادیوں کی بجائے خاردار جھاڑیوں اور تاریک پہاڑیوں کی طرف جا نکلے گا، جہاں صرف جنگلی زرد گلاب ہر آنے جانے والے اجنبی راہ گیر پہ قربان ہو جاتے ہیں..... اور مسافر انہیں پاؤں تلے روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں..... آج میں تمہیں ایسے ہی ایک زرد گلاب کی کہانی سناؤں گا..... جو ایک مسافر کے پاؤں تلے آکر کچلا گیا۔ لیکن اپنی دلکش یاد اس مسافر کے دل میں نقش کر گیا۔

آج سے بارہ سال پہلے میں ایک پہاڑی ہسپتال میں سخت بیمار تھا۔ اور اس وقت میں نے اپنی بزرگ والدہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر خدا نے مجھے اس بیماری سے نجات دی۔ تو میں اپنی باقی عمر خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گا۔

ایک شام کا ذکر ہے۔ میں بخار کی شدت سے نیم بے ہوشی کی حالت میں

پڑا تھا کہ ایک نرس میرے کمرے میں آئی اس کے ساتھ دراز قد اور خوبصورت چہرے والی ورشا بھی تھی...... وہ خاموش طبیعت تھی اور خوابوں میں کھوئے رہنا اس کی عادت تھی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا...... میں دونوں کی آواز سن سکتا تھا۔ مگر چہرے دھندلے نظر آ رہے تھے...... دوسری نرس شاملی تھی...... تم جانتے ہو کہ شاملی کی آواز کتنی میٹھی اور محبت سے بھرپور ہے۔ اور ورشا کی آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی مدھم..... جیسے وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہو۔

ایک چہرے کو کئی بار میں نے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھا اور ایک ہاتھ میری پیشانی پر کئی کئی دفعہ بخار کی شدت محسوس کر رہا تھا۔ وہ گرم ہاتھ زندگی سے بھرپور تھا، دوسرا ہاتھ جو میں نے اپنی نبض پر محسوس کیا۔ وہ سرد اور بے کیف تھا۔ میں تین دن تک موت سے جنگ کرتا رہا، اور خدا نے ورشا کے پھیلے ہوئے دامن میں میری شفا کی بھیک ڈال دی۔ ہوش آنے پر سب سے پہلے میں نے دو چہرے دیکھے سادہ اور سلگتی ہوئی آنکھوں والا شاملی کا چہرہ اور دوسرا اداس اور حسین آنکھوں والی ورشا کا چہرہ جو جذبات سے خالی تھا...... سب سے پہلے میں نے ورشا کو پکارا...... وہ میرے قریب آ گئی...... اور میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ آپ خطرے سے نکل چکے ہیں...... اتنے میں شاملی بھی میرے قریب آ گئی۔ اور ورشا سے بولی۔

”ورشا تمہیں ان کا بہت خیال رکھنا ہے کسی قسم کی لاپرواہی نہ ہو......“

"بہت بہتر میڈم..... ورشا سے کسی قسم کی لاپرواہی نہ ہوگی۔"
شاملی نے اسے حیرت سے دیکھا...... اور باہر چلی گئی.....
میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں..... ورشا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی
..... تھوڑی دیر بعد وہ میرے پلنگ کے بالکل قریب آگئی.....
اس نے اپنا سرد ہاتھ میری نبض پر رکھا میں نے آنکھیں کھول دیں.....
میری نظریں اس کی نظروں سے ملیں۔ اور وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ورشا
بہت حسین تھی...... اس کی سیاہ آنکھوں میں عجیب قسم کی اداسی اور
بے بسی تھی اس کے چہرے پر سرخی نام کو نہ تھی، بلکہ اس کا زرد رنگ ایک
کھلتا ہوا گلاب کا پھول تھا..... اس نے جذبات سے بھری ہوئی آواز
سے پوچھا..... "کیسے ہو"..... میرے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں
..... میں نے اس سے سوال کردیا..... "تمہیں کیسا لگتا ہوں؟"
"بہت اچھے" اچانک اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ پھسل پڑے
اور اس نے اپنی بوجھل پلکیں جھکا لیں..... اور خاموشی سے چلی گئی،
دوپہر کو جب وہ میرا بخار لے رہی تھی تو میں نے پوچھا "مس تم کہاں
رہتی ہو؟" وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور مسکرائی اور بولی..... "یہیں
ہسپتال میں۔"

میں نے پھر پوچھا۔

"تمہارا اپنا گھر کہاں ہے؟"

"میرا گھر —" وہ اداس ہوگئی اور پھر اپنا ہاتھ پھیلا کر کھڑکی
کے باہر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان پہاڑیوں کو دیکھتے ہو نا؟ وہاں
راستے میں ڈھیر سے جنگلی زرد رنگ کے گلاب کھلتے ہیں۔ جہاں ان

پھولوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہیں میرا گھر ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور باہر چلی گئی۔ اس کی اس ہنسی میں گہرا غم چھپا ہوا تھا......

شام کے وقت لمبے لمبے بال کھولے ورشا میرے کمرے میں آگئی اس کے بال دیکھ کر میں حیران رہ گیا...... اسکے بال بہت لمبے تھے...... وہ میرے قریب آگئی اور بولی "میں اپنے گھر جا رہی ہوں..... سوچا آپ کو بتاتی جاؤں وہاں سے ڈھیر سے پھول لاؤں گی...... ہائے مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں.... آپ کے لئے بھی لاؤں؟"...... میں نے کہا "میرے لئے پھول لانا۔" اتنے میں شاملی آگئی...... وہ شاملی کو دیکھ کر باہر بھاگ گئی....

شاملی ہنسنے لگی اور بولی "پگلی کہیں کی۔" جب شاملی میرے قریب آئی تو میں نے پوچھا "کیا ان پہاڑوں کے آس پاس کوئی بستی ہے؟"

"نہیں تو۔" وہ حیرانی سے بولی "کس نے بتایا۔ آپ کو؟"

"ورشا کہہ رہی تھی کہ میرا گھر ادھر ہے۔"

"پگلی"...... شاملی کی آواز بھرا گئی...... "اس کا کوئی گھر نہیں۔ جو آج سے اٹھارہ بیس سال پہلے ہسپتال کے سامنے گلابوں کے کنج میں ایک بچی پڑی رو رہی تھی، اور وہی یہ بدنصیب بچی ورشا ہے جو یہاں پلی اور جوان ہوئی۔" یہ کہہ کر وہ اداس ہو گئی "بڑی پیاری لڑکی ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا...... اور میں خود بھی اس پگلی کے لئے اداس ہو گیا۔

نہ جانے کیوں میرے دل میں ورشا کے لئے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ بے سہارا لڑکی کے لئے یہ ہمدردی محبت کی صورت اختیار کر گئی، میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش میں ورشا کو ہمیشہ کے لئے جیون ساتھی بنا لوں۔ اور یہ کوئی مشکل بات بھی نہ تھی۔

میرے والدین نے شامل کی بے غرض خدمت دیکھ کر اسے مجھ سے شادی میں وابستہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور میں اس بات سے بے خبر تھا۔ نہ جانے ان دنوں ورشا کیوں اداس اداس سی رہنے لگی تھی۔

ایک ماہ بعد اس کی ڈیوٹی پھر میرے کمرے میں لگی۔ وہ مجھ سے کچھ ناراض تھی..... شام کو میں نے اسے بلایا...... اس کی حسین سیاہ آنکھوں کے نیچے۔ سیاہ نشان پڑ گئے تھے..... جیسے وہ رات رات بھر جاگتی رہی ہو اس کے زرد چہرے پر ایک قسم کی پژمردگی چھائی ہوئی تھی، میں نے اس سے پوچھا...... مجھ سے تم ناراض کیوں ہو..... تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے لئے پھول لاؤنگی.... مگر تم نہ لائیں؟ وہ کھڑکی کے قریب آگئی اور باہر دیکھتے ہوئے بولی

"پھول.... پھول مجھے بہت اچھے لگتے ہیں..... اس سناٹوریم میں کئی بار پھول آئے اور مرجھا گئے۔ میں نے ان سب کی اپنی ساری محنت سے خدمت کی...... اور جب تم آئے تو..... نہ جانے میرا دل لرز گیا...... میں ان سب مریضوں کو پھولوں کا تحفہ دیتی تھی؟ اور یہی میری خدمت اور محبت کا اظہار تھا۔ لیکن میں تمہیں وہ تحفہ نہ دے سکی، جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا اور میں ڈرتی تھی کہ کہیں میرا یہ منحوس تحفہ تمہیں مجھ سے چھین نہ لے..... مجھے ویسے بھی سب منحوس تصور کرتے ہیں۔ لیکن میں نے خدا سے جس دن تمہاری حالت بہت خراب تھی، یہی دعا مانگی تھی کہ میری خالی اور ویران جھولی میں زندگی کی بھیک ڈال دے میں نے کبھی بھی اپنے لئے کچھ نہیں مانگا تھا۔ لیکن اس دن میں نے خدا کے سامنے اپنا دامن پھیلا دیا اور تمہاری صحت اور زندگی کے لئے میں اپنی ہزار زندگیاں قربان کر سکتی ہوں تمہاری صحت اور زندگی کے لئے؟

میں نے ورشا سے کہا۔ ورشا میں جانتا ہوں کہ خدا نے میری عمر دراز کردی اور تم نے جو میری خدمت کی اس کا صلہ ساری عمر ادا نہ کرسکوں گا لیکن میری خواہش ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ...... مجھ سے شادی کرلو..... میں جانتا ہوں، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، اگر تمہیں کوئی منع کرنیوالا بھی ہے تو میرے ساتھ یہاں سے دور چلی چلو۔ ہم کہیں اور جاکر شادی کرلیں گے

وہ ایک دم اداس ہو گئی ....... اور بولی" نہیں ایسا نہ کہو۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں...... اور میں نے تو خدا سے یہ وعدہ کیا ہے کہ اپنی ساری زندگی خدمت میں صرف کردوں گی..... میری یہاں کتنی عزت ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے بھلا؟

میں نے اس سے کہا" کیوں نہیں ہوسکتا؟ تم میرے ساتھ چلی چلو....

وہ تقریباً مجھے جھنجھوڑ کر بولی" نہیں..... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا.... تمہاری عزت والدین کی عزت میری نظر میں بہت بلند ہے....... ایسا خیال تمہارے دل میں کیسے آگیا...... میں ایسا قدم اٹھانے سے پہلے مرجانا پسند کردوں گی....... میری محبت اتنی سستی اور گھٹیا نہیں ہے کہ وہ ایسی اوچھی اور نیچ چیزوں کا سہارا لے کر کامیاب ہو۔

میں نے کہا" شاملی نے تمہارے بارے میں ٹھیک ہی بتایا تھا کہ تم ہر ایک سے محبت کا ناٹک رچا کر اسے برباد کردیتی ہو۔ وہی تم نے میرے ساتھ کیا۔"

"نہیں..... نہیں یہ بالکل غلط ہے....... میں نے ان سب مریضوں سے محبت کی ہے اپنے دل کی گہرائیوں سے میں نے ان سب سے محبت کی ہے۔ ان میں بچے بڑے...... جوان سب شامل ہیں۔ لیکن

جانتے ہو کہ مجھے اس کے بدلے میں کیا ملا ہے؟...... صرف ٹی، بی کے جراثیم ...... وہ سب چلے گئے یا ختم ہو گئے، لیکن کبھی کسی نے مجھ سے شادی کی تمنا نہ کی وہ جانتے تھے کہ میں ایک نرس ہوں...... اور ان سے محبت کرنا اور ان کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ کبھی کسی نے اس نرس کے جسم میں اس دل کو تلاش نہ کیا جو محبت کی بھیک بھی چاہتا تھا...... ایک تم ہو جس نے مجھ سے بہت کچھ مانگا...... لیکن وقت گزر گیا ہے۔ تم بہت دیر سے آئے ہو...... میں تمہیں کیا دے سکوں گی...... کچھ بھی نہیں میرے جسم کے خون میں دق کے جراثیم ہیں...... اور میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں...... میری آنکھوں میں دیکھو، تمہیں اپنا عکس نظر آئے گا میں تم سے محبت ضرور کرتی ہوں لیکن میری محبت ذلت اور رسوائی پر جا کر ختم نہ ہو گی..... میں کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤں گی...... تمہاری محبت خود غرض ہے جو ذلت اور رسوائی کا سہارا لے کر کامیاب ہونا چاہتی ہے میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے...... تم مجھے بھول جاؤ، میری زندگی کا چراغ تمہاری محبت کی تپش سے جلتا رہے گا اور جس دن تم مجھے بھول جاؤ گے۔ اس دن یہ چراغ بھی بجھ جائے گا...... تم محبت کا حسین خواب دیکھ رہے ہو ...... خواب بہر حال خواب ہے جو سحر ہو جانے پر ختم ہو جاتا ہے...... دوبارہ دکھائی نہیں دیتا...... اس کی سیاہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پھر بولی۔

"شاید تم نہیں جانتے کہ میں ایک بے سہارا لڑکی ہوں...... اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے...... میرا یہ خوبصورت جسم اندر سے کھوکھلا ہے۔ دق کے جراثیم نے اس کو ٹوٹے پھوٹے کھنڈر میں تبدیل کر دیا ہے

مگر شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں بھی شمع جلتی ہے..... مگر اس میں تیل کے بجائے انسان کا خون جلتا ہے..... میں اپنے خون کے آخری قطرے سے تمہاری محبت کی شمع روشن رکھوں گی..... آج میں نے تمہیں بہت کچھ کہہ دیا ہے...... شاید کبھی پھر، زندگی کے کسی موڑ پہ ہماری ملاقات ہو..... تو میں تم سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکوں گی...... خدا حافظ ـــــ" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اور باہر چلی گئی۔

چند روز بعد شاملی سے مجھے پتا لگا کہ ورشا انسپتال چھوڑ کر چلی گئی ہے..... کیونکہ وہ صحت کے اعتبار سے بہت کمزور ہو گئی تھی...... ڈاکٹر نے اسے دوسری جگہ بھیج دیا۔ کہاں؟ یہ معلوم نہیں ـــــ"

سال بیت گئے...... نہ چاہنے پر بھی میں نے شاملی سے شادی کر لی...... اور اپنی زندگی کو خدا کی خدمت کے لئے دے دیا۔ میری زندگی کو کہیں قرار نہ تھا۔ لیکن خدا کی خدمت میں سب کچھ بھول گیا...... اور میں نے ایک نئی زندگی شروع کر دی۔

یہ کہہ کر جوزف خاموش ہو گیا.......

میرے دل میں آگے سننے کا اشتیاق تھا، مگر جوزف کا اداس اور زرد چہرہ دیکھ کر کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ خود ہی بولا "جانتے ہو پھر کیا ہوا؟...... میں نے ملک ملک کی خاک چھانی.... اور پھر اچانک میرے بے قرار دل کو قرار آ گیا...... میں ورشا کو بھول گیا...... بالکل بھول گیا.... اور میں پاسبان بن گیا، میرے دل میں کلیسیا کا پیار تھا...... محبت تھی...... اور خدمت کرنے کی تمنا تھی

...... میں سب کچھ بھول گیا...... کئی سال گزر گئے اور ورشا کا خیال میرے دل کی گہرائیوں میں جانے کہاں دب کر رہ گیا۔ مجھے یاد بھی نہ رہا کہ ورشا نام کی کوئی لڑکی کبھی میری زندگی میں پل بھر کے لئے بہار بن کر آئی تھی اور اسے پھولوں کا گہوارہ بنا کر چلی گئی تھی اب وہ پھول مرجھا چکے تھے اور وہ باغ ویران ہو چکا تھا۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ میں ایک بڑی کلیسیا کا پاسبان تھا۔ کلیسیا کے لوگ مجھے دل و جان سے چاہتے تھے۔ میری عزت کرتے تھے، میری اس نئی زندگی پر ان پرانے دنوں کی ہلکی سی پرچھائیاں بھی نہ تھیں اب میں صرف ایک پاسبان تھا۔ قابل عزت اور لائق محبت

کئی بڑے دن آئے اور گزر گئے، کئی نئے سال آئے اور گزر گئے۔ ہر بار مجھے نفیس اور شاندار تحفے ملتے مگر جانتے ہو اس سال کیا ہوا؟ مجھے اس سال ایک تحفہ ملا جس نے میرے خرمن صبر و سکون کو سراسر پھونک ڈالا۔ نئے سال کی عبادت کے بعد میں گھر پہنچا تو شالی نے کہا "آج میں آپ کو ایک ایسا تحفہ دوں گی جس کا خیال تک آپ کو نہ آیا ہوگا" جانتے ہو وہ تحفہ کیا تھا؟ ورشا کی ایک بڑے سائز کی تصویر!! یہ تحفہ کھانے کی میز پر میرے بالکل سامنے رکھا تھا۔ شالی نے یہ تصویر سامنے والی دیوار پر ٹانگ دی۔ میں نے چند لمحوں کے لئے تصویر کو غور سے دیکھا میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا اور میں کھانا میز پر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شالی کچھ سہم گئی۔ میں تصویر کے پاس گیا۔ ورشا کی آنکھیں جیسے مجھ سے کہہ رہی تھیں "جس دن تمہارے دل میں میری محبت ختم ہو جائے گی اس دن میری زندگی کا چراغ بجھ جائے گا" کیا ورشا سچ کہہ رہی تھی؟ خدا جانے۔

کیا پتا وہ ابھی تک ایک ہرجائی عورت کی طرح زندگی بسر کر رہی ہو.....

اور پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور شاملی نے مجھے بتایا کہ ہسپتال سے فون آیا ہے کسی کا انتقال ہوگیا ہے اور مجھے بلایا جا رہا ہے ۔۔ بادل نخواستہ میں تیار ہوا اور شاملی بھی میرے ہمراہ ہولی۔

ہسپتال پہنچ کر ایک کمرے میں دیکھا کہ ایک خوبصورت پلنگ پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے اور تعجب یہ کہ وہ سب پھول زرد رنگ کے گلاب کے تھے۔

شاملی نے چادر کا کونا سرکا کر لاش پر نظر ڈالی تو ایک ہلکی سی چیخ اسکے منہ سے نکل گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

چادر کے نیچے وؔرشا کا زرد گلاب کا سا پژمردہ چہرہ پڑا تھا۔ اس ورشا کا چہرہ جس نے مجھ سے بے لوث محبت کی تھی۔ وہی ورشا جسے میں ہرجائی کہہ چکا تھا۔ ورشا نے اپنے خون کے آخری قطرہ تک، محبت کے چراغ کو روشن کیے رکھا تھا۔

بعد کو معلوم ہوا کہ وؔرشا اس ہسپتال سے جانے کے بعد نو سال تک تڑپتی اور سسکتی رہی۔ وہ میرے شہر میں تھی اور مجھے معلوم نہ تھا۔ اس نے کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کی۔ مرنے سے پہلے اس نے کئی بار میرا نام لیا مجھے پکارا لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا جوزؔف تو نو سال قبل ہی مر چکا تھا جب اس کی شادی شاملی سے ہوئی تھی۔ اب یہ جوزؔف تو خدا کا تھا اور اس شہر کی کلیسیا کا پاسبان!!

# ہماری دیگر مطبوعات

(۱) ابوّت خدا اور ابنیّتِ مسیح ۔

(پادری برکت اللہ ایم اے) ۲۵ پیسے

(۲) مسیح کی موت کے مختلف پہلو ۲۵ پیسے

(۳) الحمد اللہ (مجموعہ ادعیّہ)

(ارنسٹ ہان) ۴۰ پیسے)

(۴) مسیحیت کی عالمگیری

(پادری برکت اللہ ایم اے) چار روپے

(۵) ابن مریم کی شان اور شہادتِ انجیل و قرآن

(پادری برکت اللہ ایم اے) ۲۵ پیسے

(۶) صحتِ کتب مقدسہ (ارنسٹ ہان) ۲۵ پیسے

(۷) خدا کے وعدے (ارنسٹ ہان) دو روپے

(۸) رنگ زار (مشاعرۂ لکھنؤ کا انتخاب)

مرتبہ ریحانی لکھنوی ایک روپیہ

(۹) نوائے ازل (منتخب مسیحی غزلوں کا مجموعہ)

مرتبہ ریحانی لکھنوی ۵۰ پیسے

(۱۰) رازِ محبت (کرسمس سے متعلق مسیحی شعرا کا کلام)

مرتبہ ریحانی لکھنوی ایک روپیہ

# تبلیغی کتابچے

| | |
|---|---|
| (۱) زندہ مسیح کے قدموں میں | ۱۵ پیسے |
| (۲) اخلاص و خلاص | ۵ پیسے |
| (۳) سحی منصور | ۱۰ پیسے |
| (۴) احسان فراموش | ۱۰ پیسے |
| (۵) کربلا سے کلوری تک | ۱۵ پیسے |
| (۶) غیر مطمئن ملکہ | ۵ پیسے |
| (۷) سکہ جو ٹھیک نہیں بجتا تھا | ۵ پیسے |
| (۸) نیک نیت کا کھیت | ۵ پیسے |
| (۹) کیا انجیل میں تحریف ہوئی ؟ | ۱۵ پیسے |
| (۱۰) بادشاہ اور نبی | ۵ پیسے |
| (۱۱) خدا محبت ہے | ۵ پیسے |
| (۱۲) خدا ہمارا آسمانی باپ ہے | ۱۰ پیسے |
| (۱۳) دلدل | ۵ پیسے |
| (۱۴) عجیب و غریب راستہ | ۵ پیسے |
| (۱۵) دہلیز اور گوشہ | ۵ پیسے |
| (۱۶) الحنوتی کا انتقام | ۵ پیسے |

ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ پوسٹ بکس ۱۳۴ لکھنؤ ۔ اتر پردیش
پونا کرسچن بک شاپ ۲۶۷/۱ مہاتما گاندھی روڈ پونا ۱ مہاراشٹر

# پادری عبدالحق صاحب کی تصنیفات

(۱) اثباتُ التثلیث فی التوحید .. .. .. قیمت ۲ روپیہ

(۲) قِرانُ السّعدین .. .. .. .. .. قیمت ۷۵ پیسے

(۳) ردِّ بُہتانِ قادیانی .. .. .. .. .. قیمت ۷۵ پیسے

(۴) تحریری مناظرہ .. .. .. قیمت ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

(۵) شریعت اور فضل (بزبان انگریزی) .. .. قیمت ۲۵ پیسے

(۶) مذہب کی حقیقت (بزبان انگریزی) .. .. قیمت ۲۵ پیسے

یہ تمام کتب مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجیے :-

پادری عبدالحق صاحب بنگلہ نمبر ۱۶: سیکٹر 19—A

~~چنڈی گڑھ~~، مشرقی پنجاب (بھارت)

# بھولے کبوتر ہوشیار سانپ

یہ کتاب ہند و پاک کے آٹھ مسیحی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مجموعہ ہے ان افسانوں میں شمالی ہند و پاک کے مسیحی معاشرہ کے تاریک اور روشن پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور ایک عظیم اقلیت کے درد و کرب، عیش و طرب، قہقہوں، نالوں اور امید و یاس کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے